کوہ پیما

احمد ندیم قاسمی

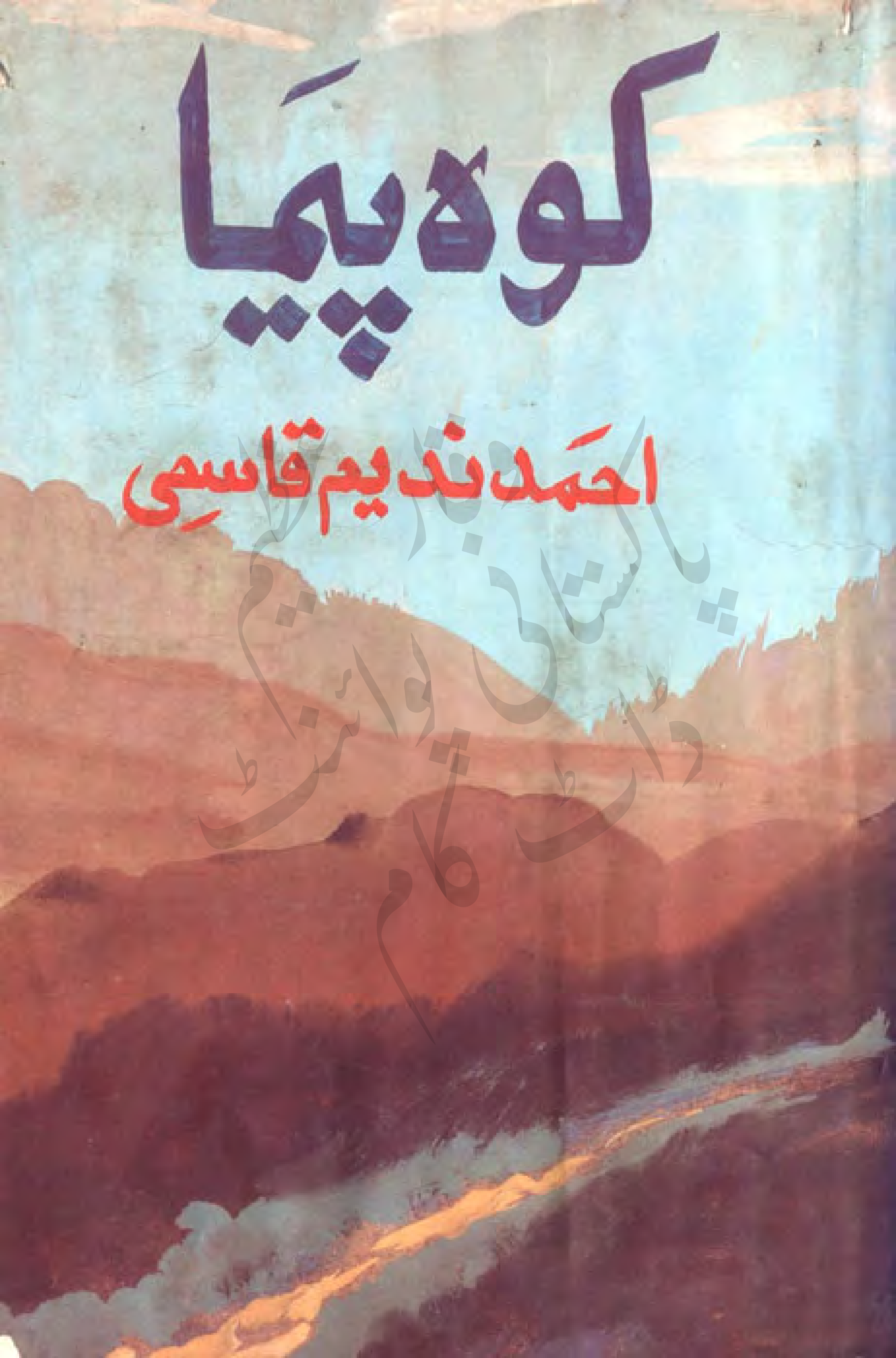

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

ترتیب

۱۔ بَین ۱۱

۲۔ کوہ پیما ۲۵

۳۔ چُبھن ۳۸

۴۔ اخبار نویس ۴۷

۵۔ عاجز بندہ ۶۳

۶۔ چرواہا ۷۳

۷۔ ایک یک لباس آدمی ۸۴

۸۔ پیپل والا تالاب ۹۱

۹۔ چھلّی ۹۹

۱۰۔ ٹریکٹر ۱۱۲

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

بَین

بس کچھ ایسا ہی موسم تھا میری بچی' جب تم سولہ سترہ سال پہلے میری گود میں آئی تھیں۔ بکائن کے اودے اودے پھول اسی طرح مہک رہے تھے اور بیریوں پر گلہریاں' تنے سے چوٹی تک اسی طرح بھاگی پھرتی تھیں' اور ایسی ہوا چل رہی تھی جیسے صدیوں کے سوکھے کواڑوں سے بھی کونپلیں پھوٹ نکلیں گی۔ جب تم میری گود میں آئی تھیں تو دیے کی کالی پیلی روشنی میں اُونگھتا ہوا کوٹھا چمکنے سا لگا تھا اور دایہ نے کہا تھا کہ ہائے ری اس چھوکری کے تو انگ انگ میں جگنو ٹکے ہوئے ہیں! اس وقت میں نے بھی درد کے خمار میں اپنے جسم کے اس ٹکڑے کو دیکھا تھا اور مجھے تو یاد نہیں پر دایہ نے بعد میں مجھے بتایا تھا کہ میں مسکرا کر' تمھارے چہرے کی دمک میں اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو یوں دیکھنے لگی تھی جیسے کوئی خط پڑھتا ہے۔

اگلی رات جب تُمھارے بابا نے موقع پا کر تمہیں دیکھا تھا تو اداس ہو گیا تھا' اور میں نے کہا تھا--- "تم تو کہتے تھے بیٹا ہو یا بیٹی

سب خدا کی دین ہے۔ پھر اب کیوں منہ لٹکا لیا ہے۔" اور اس نے کہا تھا۔ "تو نہیں جانتی نا بھولی عورت۔ تو ماں ہے نا۔ تو کیسے جانے کہ خدا اتنی خوبصورت لڑکیاں صرف ایسے بندوں کو دیتا ہے۔ جن سے وہ بہت خفا ہوتا ہے۔" اس وقت میرا جی چاہا تھا کہ میں تمھارے بابا کی آنکھیں اس کی کھوپڑی میں سے نکال کر باداموں کی طرح توڑ دوں کیونکہ میری جان' وہ تو تمہیں اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے چڑیاں سانپ کو دیکھتی ہے۔ وہ تمھاری خوبصورتی دیکھ کر ڈر گیا تھا اور پھر اس نے اپنی عمر کے سولہ سترہ سال تم سے ڈرتے ڈرتے گزار دیے۔ وہ اب بھی ڈرا اور سہا ہوا' باہر گلی میں بچھی ہوئی چٹائیوں پر' لوگوں میں گھرا بیٹھا ہے اور آسمانوں کو یوں دیکھ رہا ہے جیسے کوئی اس کی طرف آ رہا ہے۔

تم مجھ پر تو نہیں گئی تھیں میری بچی۔ میں تو گاؤں کی ایک عام سی لڑکی تھی۔ میرا ناک نقشہ بالکل سیدھا سادا تھا۔ ہاں' تم اپنے بابا پر گئی تھیں جو بہت خوبصورت تھا۔ وہ تو اب بھی خوبصورت ہے پر اب اس کی خوبصورتی سولہ سترہ سال کی گرد سے اٹ گئی ہے۔ اب بھی اس کی بڑی بڑی' چیرویں' بادامی آنکھیں ہیں اور اب بھی اس کے چہرے اور مونچھوں کے رنگ میں سونا ہے۔ پر جب تم پیدا ہوئی تھیں نا' تو وہ بالکل مورت تھا۔ تم آئیں تو وہ ڈر گیا تھا مگر اس ڈر نے اس کی شکل نہیں بدلی۔ بس ذرا سی بجھا دی۔ تمھارے آنے کے بعد میں نے اس کے موتیوں کے سے دانت بہت کم دیکھے۔ اس کے پنکھڑی ہونٹ ہمیشہ یوں بھنچے رہے جیسے کھلے تو کچھ ہو جائے گا۔ ابھی کچھ دیر پہلے جب وہ آیا اور اس نے تمہیں دیکھا تو مجھے ایسا لگا جیسے کسی بہت بڑے محل کی بنیادیں بیٹھ

رہی ہیں۔ وہ یہاں کھڑے کھڑے ہی ایک دم اندر سے بوڑھا ہو گیا۔ جب وہ پلٹا تو میں ڈری کہ وہ گلی تک پہنچنے سے پہلے ہی ڈھیر ہو جائے گا۔ مگر ابھی ابھی میں نے دیوار پر سے جھانکا ہے تو وہ گلی میں بیٹھا ہے اور جمع ہوتے ہوئے لوگوں کو یوں ڈر ڈر کر' چونک چونک کر دیکھ رہا ہے جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہے۔

تم جب تین چار سال کی ہو کر بھاگنے دوڑنے لگیں تو دیکھنے والوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ مٹی کا بنا ہوا انسان اتنا خوبصورت بھی ہو سکتا ہے۔ ایک بار تم گر پڑیں اور تمھارے ماتھے پر چوٹ آئی تو میں تو روتے روتے نڈھال ہو گئی پر تمھارے بابا نے چہک کر کہا تھا۔ "خدا جو بھی کرتا ہے' ٹھیک کرتا ہے۔ ہماری رانو بیٹی کے ماتھے پر چوٹ کے نشان نے اس کی خوبصورتی کو داغ دار کر دیا ہے۔" پر خدا کو تو کچھ اور منظور تھا۔ چوٹ کا نشان تو باقی رہ گیا مگر یہ نشان بالکل نئے نئے چاند کا سا تھا —— لال لال سا بھی اور سنہرا سنہرا سا بھی' جو اَب میری جان' پیلا پیلا سا لگ رہا ہے۔

پھر جب تم پانچ سال کی ہوئیں تو میں نے قرآن شریف پڑھانے کے لیے تمہیں بی بی جی کے پاس بٹھا دیا۔ تب پتہ چلا کہ تمھاری آواز بھی تمھاری طرح خوبصورت ہے۔ بی بی جی کے گھر کی دیواروں کے اندر قرآن شریف پڑھنے والی بچیوں کی آوازیں آتی تھیں تو ان میں سے میری رانو بیٹی کی آواز صاف پہچانی جاتی تھی۔ تمھاری آواز میں چاندی کی کٹوریاں بجتی تھیں۔ ایسی کھنک کہ تم چپ بھی ہو جاتی تھیں تو جب بھی چار طرف سے جھنکار سی اٹھتی رہتی تھی۔ پھر یوں ہوا کہ پہلے تم

آیت پڑھتی تھیں اور تمھارے بعد تمھاری ہم سبقوں کی آوازیں آتی تھیں۔ یوں جب تم اکیلی پڑھ رہی ہوتی تھیں تو گلی سے گزرنے والوں کے قدم رک جاتے تھے اور چڑیوں کے غول منڈیروں پر اتر آتے تھے۔ ایک بار مزار سائیں دولھے شاہ جی کے مجاور سائیں حضرت شاہ اِدھر سے گزرے تھے اور تمھاری آواز سن کر انھوں نے کہا تھا ——— یہ کون لڑکی ہے۔ جس کی آواز میں ہم فرشتوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سن رہے ہیں! ——— اور جب تمھیں معلوم ہوا تھا کہ سائیں حضرت شاہ نے تمھارے بارے میں یہ کہا ہے تو تم اتنی خوش ہوئی تھیں کہ رونے لگیں تھیں۔

تب یوں ہوا کہ عورتیں پانی سے بھرے ہوئے برتن لاتیں اور تمھاری تلاوت ختم ہونے کا انتظار کرتی رہتیں۔ تم قرآن پاک بند کر کے اٹھتیں اور "طفیل سائیں دولھے شاہ جی" کہتی ہوئی' ان برتنوں پر "چھو" کرتیں اور عورتیں یہ پانی اپنے عزیزوں کو پلاتیں تو بیمار اچھے ہو جاتے۔ برے نیک ہو جاتے۔ بے نماز نمازی ہو جاتے!

اُن دنوں مجھے یوں لگنے لگا جیسی تم نور کی بنی ہوئی تو خیر ہمیشہ سے ہو پر اب تم بی بی جی کے ہاں سے واپس گھر میں آتیں تو تمھارے چہرے پر میری نظریں نہ جم پاتیں' جیسے/سورج پر نظر نہیں جمتی۔

خدا اور رسولؐ کے بعد تم سائیں دولھے شاہ جی کا نام جپتی رہتی تھیں۔ اسی لیے تو تمھارا بابا ایک بار تمھیں سائیں دولھے شاہ جی کے مزار پر سلام بھی کرا لایا تھا۔

قرآن شریف تم نے اتنا پڑھا میرے جگر کی ٹکڑی! کہ اب بھی

جب چار طرف سناٹا ہے اور صرف اِدھر اُدھر سے سسکی کی آواز آ جاتی ہے' میں تمھارے آس پاس' تمھاری ہی آواز میں قرآن شریف کی تلاوت سن رہی ہوں۔ تمھارے ہونٹ تو نہیں ہل رہے' پر میں اپنے دودھ کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ یہ آواز تمھاری ہے۔ زمین پر ایسی نورانی آواز میری رانو کے سوا اور کس کی ہو سکتی ہے۔

ایک دن جب تمھارے چاچا دین محمد کی بیوی اپنے بیٹے کے لیے تمھارا رشتہ پوچھنے آئی تو تب مجھے معلوم ہوا کہ تم شادی کی عمر کو پہنچ گئی ہو۔ مائیں تو بیٹی کے سر پر چُنّی لیتے ہی سمجھ جاتی ہیں کہ وقت آ رہا ہے پر تمھارے بارے میں تو میں سوچ ہی نہ سکی۔ تم نے سوچنے کی مہلت ہی نہ دی۔ میں نے تمھارے بابا سے اپنی اس بے خبری کی بات کی تو وہ بولا۔ "تُو تو سدا کی بے خبری ہے پر میں ایسا بے خبر نہیں ہوں۔ بس یہ ہے کہ مجھے لڑکی سے ڈر لگتا ہے۔ اس سے بھی تو بات کرو۔ اس نے تو جیسے اپنا سب کچھ مولا کی راہ میں تج دیا ہے۔"

تب پہلی بار مجھے بھی تم سے خوف آیا۔ میں نے سوچا اگر میں نے تم سے رشتے کی بات کی تو کہیں تم جلال میں نہ آ جاؤ۔ مگر پھر اسی شام کو سائیں حضرت شاہ کا ایک خادم آیا اور اس نے بتایا کہ کل سے سائیں دولھے شاہ جی کا عرس ہے جو تین دن تک چلے گا' اور سائیں حضرت شاہ نے خواب میں سائیں دولھے شاہ جی کو دیکھا ہے اور یہ فرماتے سنا ہے کہ میری چیلی رانو کو بلا کر تین دن تک اس سے میرے مزار پر قرآن شریف کی تلاوت کراؤ ورنہ سب کو بھسم کر دوں گا۔ تم جانتی تھیں بیٹی کہ سائیں دولھے شاہ جی بڑے جلال والے سائیں تھے۔

زندگی میں جس نے بھی ان کے خلاف بات کی' اسے بس ایک نظر بھر کر دیکھا اور راکھ کر ڈالا۔ مرنے کے بعد ان کی درگاہ میں یا اس کے آس پاس کوئی برا کام یا بری بات ہو جائے تو ان کا مزار شریف سرہانے کی طرف سے کھل جاتا ہے اور اس میں سے ان کا ایک دست مبارک بلند ہوتا ہے۔ برا کام یا بری بات کرنے والا جہاں بھی ہو' کھنچا چلا آتا ہے' اپنی گردن سائیں جی کے دست مباک میں دے دیتا ہے اور پھر وہیں ڈھیر ہو جاتا ہے۔ سائیں جی کا دست مبارک واپس مزار شریف میں چلا جاتا ہے اور مزار شریف کی دراڑیں یوں مل جاتی ہے جیسے کبھی کھلی ہی نہیں تھی۔

کس کی مجال تھی کہ سائیں دولھے شاہ کا حکم ٹالتا۔ دوسرے دن صبح کو ہم تینوں ایک اونٹ پر کجاوے میں بیٹھے تھے اور درگاہ سائیں دولھے شاہ جی کی طرف جا رہے تھے۔ میں کجاوے کے ایک طرف تھی اور تم میری جان' دوسری طرف تھیں اور درمیان میں اونٹ کے پالان پر تمھارا بابا بیٹھا تھا۔ اونٹ جونہی اٹھا تھا اور چلنے لگا تھا تو تم نے قرآن شریف کی تلاوت شروع کر دی تھی' اور میری پاک اور نیکی بچی' میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ ہمارا اونٹ جہاں سے بھی گزرا تھا' لوگ دور دور سے کھنچے چلے آئے تھے۔ وہ ہمارے ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور رو رہے تھے اور سبحان اللہ سبحان اللہ کہہ رہے تھے اور کجاوے کے اوپر چڑیوں اور ابابیلوں اور کبوتروں کے جھنڈ کے جھنڈ آتے تھے اور غوطہ لگا کر اور جیسے میری بچی کی آواز کا شربت پی کر ناچتے تیرتے ہوئے دور نکل جاتے تھے۔ اور میں سوچتی تھی کہ یہ ہم گنہگاروں کی کس نیکی کا

بدلہ ہے کہ خدا نے ہمیں ایسی بیٹی بخشی ہے جو زمین پر قرآن شریف کی تلاوت کرتی ہے تو اس کی آواز آسمان تک جاتی ہے۔ آسمان کا خیال مجھے یوں آیا تھا کہ ایک بار تمھارے بابا نے پالان پر سے جھک کر میرے کان میں ہولے سے کہا ——— "اوپر دیکھو۔ یہ کیسے نورانی پرندے ہیں جو ہمارے ساتھ ساتھ اڑ رہے ہیں۔ میں نے ان علاقوں میں ایسا پرندہ کبھی نہیں دیکھا کہ ان کے پروں میں ستارے چمکتے ہوں۔ یہ تو آسمانوں سے اتر کر آنے والے فرشتے معلوم ہوتے ہیں!" ——— اور میری آنکھوں کا نور بچی' میں' تمھاری جاہل ماں بھی قسم کھا کر کہہ سکتی ہوں کہ وہ فرشتے ہی تھے ——— کچھ ایسے جیسے ننھے منے بچوں کے پر لگ گئے ہوں اور وہ ہوا میں ہمکتے پھرتے ہوں ——— وہ میری پہنچی ہوئی بیٹی سے تلاوت سننے آئے تھے۔

پھر جب درگاہ سائیں دولھے شاہ جی کے پاس ہمارا اونٹ بیٹھا تھا تو جیسے تم بھول گئی تھیں کہ تمھارے ساتھ تمھارے ماں باپ بھی ہیں۔ تم مزار شریف کی طرف یوں کھنچی چلی گئی تھیں جیسی سائیں دولھے شاہ تمھاری انگلی پکڑ کر تمھیں اپنے گھر لیے جا رہے ہوں۔ مزار شریف کو بوسہ دے کر اور اس کے ایک طرف بیٹھ کر تم نے قرآن شریف کی تلاوت شروع کر دی تھی اور تمھاری آواز کی مٹھاس چکھنے کے لیے عرس پر آنے والے لوگ مزار شریف پر ٹوٹ پڑے تھے۔ ہم دونوں نے مزار شریف کو اپنی پوروں سے چھوا اور پھر اپنی پوریں چوم لیں۔ پھر ہم سائیں حضرت شاہ کی خدمت میں ان کے زانوؤں کو چھونے اور دستِ مبارک کو چومنے پہنچے تھے اور انھوں نے فرمایا تھا۔ "اپنی بیٹی

کو سائیں جی کے قدموں میں بٹھا کر تم نے اپنے اگلے پچھلے سب گناہ معاف کرا لیے ہیں۔ تم انشاء اللہ جنّتی ہو۔" یہ سن کر خوشی سے ہماری سانسیں پھول گئی تھیں۔ پھر میں نے اندر جا کر بی بیوں کو سلام کیا تھا اور تمہیں ——— میری جان ——— سائیں دولھے شاہ جی اور سائیں حضرت شاہ اور ان کے گھرانے کی بی بیوں کی امانت میں دے کر ہم دونوں یہ کہہ کر واپس گاؤں آ گئے تھے کہ عرس کے تین دن گزرنے کے بعد اگلے روز ہم اپنی اس نعمت کو لینے حاضر ہو جائیں گے جو خدا نے اور اس کے حبیب پاکؐ نے ہم غریبوں گنہگاروں کو ہماری کسی سیدھی سادی نیکی سے خوش ہو کر بخشی ہے۔

اے میری بچی، اے میرے جگر کی ٹکڑی، اے میری صاف ستھری رانو بیٹی! پھر جب تین دنوں کے بعد ہم دونوں سائیں دولھے شاہ جی کے مزار شریف پر گئے تھے تو تم وہیں بیٹھی تھیں جہاں ہم تمہیں بٹھا گئے تھے، مگر کیا یہ تمہی تھیں؟ تمہاری آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئی تھیں۔ تمہارے ہونٹوں پر جمے ہوئے خون کی پپڑیاں تھیں۔ تمہارے بال الجھ رہے تھے۔ چادر تمہارے سر سے اتر گئی تھی۔ مگر اپنے بابا کو دیکھ کر بھی تمہیں اپنا سر ڈھانپنے کا خیال نہ آیا تھا۔ تمہارا رنگ مٹی مٹی ہو رہا تھا اور ہمیں دیکھتے ہی تم چلّا پڑی تھیں ——— "مجھ سے دور رہو بابا۔ میرے پاس نہ آنا اماں۔ میں اب یہیں رہوں گی۔ میں اُس وقت تک یہیں رہوں گی جب تک سائیں دولھا شاہ جی کا مزار شریف نہیں کھلتا اور اس میں سے ان کا دست مبارک نہیں نکلتا۔ جب تک فیصلہ نہیں ہوتا، میں یہیں رہوں گی۔ جب تک انصاف نہیں ہوتا میں یہیں

رہوں گی۔ اور مزار شریف کھلے گا۔ آج نہیں تو کل کھلے گا۔ ایک مہینہ بعد، ایک سال بعد، دو سال بعد سہی، پر مزار شریف ضرور کھلے گا اور دست مبارک ضرور نکلے گا۔ تب میں خود ہی اپنے بابا اور اپنی اماں کے قدموں میں چلی آؤں گی اور ساری عمر ان کی جوتیاں سیدھی کروں گی اور ان کے پاؤں دھو دھو کر پیوں گی۔ پر اب میں نہیں آؤں گی۔ اب میں نہیں آ سکتی۔ میں بندھ گئی ہوں۔ میں مر گئی ہوں۔" پھر تمہیں ایک دم بہت سا رونا آ گیا تھا مگر تم نے ایک دم اپنے آنسو روک لئے تھے اور تم بھیگی ہوئی آواز میں تلاوت کرنے لگیں تھیں۔ آس پاس کھڑے ہوئے بیسیوں لوگ ہمارے ساتھ زار زار رونے لگے تھے اور کہنے لگے تھے۔ "اثر ہو گیا ہے۔ دن رات مزار شریف پر رہنے سے اس پر اثر ہو گیا ہے۔"

تمہارے بابا نے فریاد کی تھی۔ "اثر ہو گیا ہے؟ دن رات قرآن شریف کی تلاوت کرنے والی لڑکی پر کوئی اثر کیسے ہو سکتا ہے۔ اور اگر تم کہتے ہو کہ اثر ہو گیا ہے تو سائیں حضرت شاہ کہاں ہیں؟" وہ روتا ہوا سائیں حضرت شاہ کی طرف چل پڑا تھا اور میں بلکتی ہوئی اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ مگر ہمیں خادموں نے بتایا تھا کہ سائیں جی تو عرس کے فوراً بعد ایک حجرے میں بند ہو کر بیٹھ جاتے ہیں اور کئی دنوں تک وظیفہ فرماتے ہیں اور کسی سے نہیں ملتے۔ پھر میں نے اندر بی بیوں کے پاس جانا چاہا تھا مگر بڑے دروازے پر خادماؤں نے بتایا تھا کہ رانو کی حالت سے بی بیاں پہلے ہی بہت پریشان ہیں اور انہیں اور زیادہ پریشان کرنا گناہ ہے۔

ہم پھر لپک کر مزار شریف کی طرف گئے تھے مگر اب کے میری بچی، تم نے ہمیں دیکھا تو تمھیں جلال آ گیا تھا اور تم نے اتنے زور سے چیخ کر کہا تھا "تم چلے کیوں نہیں گئے" کہ مجھے یقین نہیں آیا تھا کہ یہ چیخ اس حلق سے نکلی ہے جس نے تلاوت کے سوا کبھی کچھ کیا ہی نہیں۔

ہم اُجڑے پُجڑے ماں باپ، مزار شریف سے ایک طرف ہٹ کر بیٹھ گئے تھے اور رو رہے تھے اور لوگ ہمیں روتا دیکھ کر رو رہے تھے کہ سائیں حضرت شاہ جی کا خاص خادم آیا تھا اور اس نے بتایا تھا کہ سائیں جی کو بھی رانو کی اس حالت کا بڑا دکھ تھا اور انھوں نے فرمایا تھا کہ یہ لڑکی اچانک جن بھوت کے قبضے میں چلی گئی ہے اور سائیں حضرت شاہ ایک خاص وظیفہ فرما رہے ہیں کہ یہ جن اترے تو اس امانت کو اس کے ماں باپ تک پہنچایا جائے۔ پھر حکم ہوا تھا کہ تم جاؤ اور رانو کو درگاہ شریف کی نگرانی میں رہنے دو۔

"اب تم جاؤ۔" ہمارے سروں پر تمھاری آواز آئی تھی اور ہم نے سر اٹھا کر دیکھا تھا کہ تمھاری آنکھیں تالابوں کی طرح بھری ہوئی تھیں۔ "اب تم جاؤ میرے بابا۔ جاؤ میری اماں۔ اب تم جاؤ۔ مزار شریف ضرور کھلے گا۔ دستِ مبارک ضرور نکلے گا۔ فیصلہ ضرور ہو گا۔ فیصلہ ہو جائے گا تو میں سیدھی تمھارے پاس پہنچوں گی۔ سائیں دولھے شاہ جی خود مجھے تمھارے پاس چھوڑ جائیں گے۔ اب تم جاؤ" —— یہ کہہ کر تم مزار شریف کی طرف پلٹ گئی تھیں اور تم چلتے ہوئے یوں ڈول رہی تھیں جیسے کٹی ہوئی پتنگ ڈولتی ہے۔

میں تم پر سے صدقے جاؤں میری بیٹی۔ ہم تمھارے ماں باپ

اس کے بعد بار بار تمھارے پاس پہنچے مگر اب تو تم ہمیں پہچانتی بھی نہیں تھیں۔ ہم تمھیں پکارتے تھے تو تم ہماری طرف یوں خالی خالی آنکھوں سے دیکھتی تھیں جیسے حیران ہو رہی ہو کہ یہ آواز کدھر سے آئی ہے۔ تمھارا رنگ خاکستری ہو گیا تھا۔ تمھارے ہونٹ اکڑ کر پھٹ گئے تھے۔ تمھارے بالوں میں گرد تھی اور تنکے تھے اور ٹوٹے ہوئے خشک پتے تھے۔ ایک بار جب ہم تمھارے لیے کپڑوں کا نیا جوڑا لے کر گئے اور ہم نے یہ کپڑے تمھارے سامنے رکھ دیے تو تم یہ کپڑے ہاتھ میں لے کر اٹھیں اور ایک طرف چل پڑیں۔ تمھارا ایک بھی قدم سیدھا نہیں اٹھتا تھا۔ پھر تم غائب ہو گئی تھیں اور ہم خوش ہوئے تھے کہ تم کپڑے بدلنے گئی ہو۔ مگر پھر ایک دم ایک طرف سے شور اٹھا تھا۔ تم اسی رفتار سے واپس آ رہی تھی اور تمھارے پیچھے درگاہ شریف کے چند خادم تھے جنھوں نے بتایا تھا کہ تم نے نئے کپڑوں کا یہ جوڑا درگاہ شریف کے لنگر کی دیگ کے نیچے بھڑکتی آگ میں جھونک دیا تھا۔

تلاوت تو تم اب بھی کر رہی تھیں مگر آواز میں چاندی کی کٹوریاں نہیں بجتی تھیں۔ پھر تم پڑھتے پڑھتے مزار شریف کے سرہانے کی طرف جھک جاتی تھیں۔ جیسے کوئی جھری، کوئی دراڑ ڈھونڈنے کی کوشش میں ہو۔ پھر تم ٹوٹ کر رو دیتی تھیں اور تلاوت کو روک کر ہولے ہولے جیسے خود کو سمجھاتی تھیں —— مزار شریف ضرور کھلے گا۔ دست مبارک ضرور نکلے گا۔ فیصلہ ضرور ہو گا۔ انصاف ضرور ہو گا —— پھر تم آنکھیں بند کر لیتی تھیں اور تلاوت میں مصروف ہو جاتی تھیں۔

ایک بار ہم سائیں حضرت شاہ کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے تھے اور عرض کیا تھا کہ تلاوت کلام پاک کرنے والوں کے پاس جن نہیں پھٹکتے۔ دور بیٹھے سنتے رہتے اور جھومتے رہتے ہیں اور اگر ہماری ہیرا بیٹی پر ایسے کافر جن آ گئے ہیں جو قرآن شریف کی تلاوت کا بھی لحاظ نہیں کرتے' تو یہ آپ کی درگاہ شریف ہی کے جن ہیں۔ آپ کے حکم سے اتر جائیں گے۔ خدا کے نام پر' رسول پاکؐ کے نام پر' پیر دستگیر کے نام پر' سائیں دولھے شاہ جی کے نام پر ہمارے ساتھ مزار شریف پر چلیئے اور یہ جن اتاریئے۔ اور سائیں حضرت شاہ نے فرمایا تھا کہ ہم جن تو اتار دیتے مگر تم نے ٹھیک کہا۔ یہ کوئی بڑا کافر جن ہے اور کافر جن ہمارے قبضے میں نہیں ہیں۔ ہم یہاں دعا کر رہے ہیں۔ تم گھر جا کر دعا کرو۔ ہمارا وظیفہ جاری رہے گا۔

جب ہم ٹوٹے پھوٹے واپس آ رہے تھے تو بی بیوں کی ایک بوڑھی خادمہ نے مجھے ایک طرف لے جا کر بتایا تھا کہ عرس کے تیسرے دن سائیں حضرت شاہ مزار شریف کی طرف آئے تھے تو تمھاری بدنصیب بیٹی نے مزار شریف پر سے گول گول لہریے پتھر اٹھا کر جھولی میں بھر لیے تھے اور چیخ چیخ کر کہا تھا کہ سائیں! مزار شریف سے دست مبارک تو جب نکلے گا' نکلے گا۔ اگر تم ایک قدم بھی آگے بڑھے تو میں سائیں دولھے شاہ جی کے دیے ہوئے ان پتھروں سے تمھارا ناس کر دوں گی! خادم تمھاری بیٹی کو پکڑ کر مارنے پیٹنے کے لیے آگے بڑھے تھے تو سائیں جی نے انھیں روک کر کہا تھا کہ نادانو یہ لڑکی نہیں بول رہی ہے' اس کے اندر کا کافر جن بول رہا ہے۔ جب تک یہ مزار شریف پر قابض

ہے' ہمیں اور ہمارے خاندان کے کسی مرد عورت کو اِدھر نہیں آنا چاہیے ورنہ کیا خبر یہ جن کیا کر بیٹھے۔

پھر رات درگاہ شریف کا ایک خادم آیا کہ تمھاری بیٹی تمھیں بلا رہی ہے۔ ہم راتوں رات گرتے پڑتے وہاں پہنچے تو تم مزار شریف کی پائنتی لیٹی ہوئی تھی۔ چراغ کی روشنی میں ہم نے دیکھا کہ تمھاری نظریں ٹِک گئی تھیں اور تمھارے ہونٹ ذرا ذرا سے ہل رہے تھے۔ ظاہر ہے تم اُس وقت بھی تلاوت ہی کر رہی تھیں۔ پھر جب میں نے تمھارا سر اپنی گود میں رکھا اور تمھارے بابا نے تمھارا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر رونا شروع کر دیا تو نہایت ہی کمزور آواز میں تم نے کہا تھا۔ "میری اماں۔ میرے بابا۔ کون جانے مزار شریف کیوں نہیں کھلا۔ انصاف تو نہیں ہوا پر چلو فیصلہ تو ہو گیا۔ چلو میں ہی گنہگار سہی۔ سائیں دولھے شاہ جی' آپ نے تو بڑا انتظار کرایا۔ اب قیامت کے دن جب ہم سب خدا کے سامنے پیش ہوں گے ـــــ جب ہم خدا کے سامنے پیش ہوں گے ـــــ خدا کے سامنے ـــــ خدا کے سامنے!" اس کے بعد تم چپ ہو گئی تھیں اور تب سے چپ ہو۔

پھر ہم تمھیں یہاں گھر میں اٹھا لائے۔ اور جب ابھی صبح سویرے سائیں حضرت شاہ کا خاص خادم' سائیں جی کی طرف سے تمھارے لیے کفن لایا تو تم پر اترا ہوا جن جیسے تمھارے بابا پر آ گیا۔ اس نے کفن ہاتھ میں لیا اور اسے اس چولھے میں جھونک دیا جس پر تمھیں غسل دینے کے لیے پانی گرم کیا جا رہا تھا۔

اب میرے جگر کی ٹکڑی' میری نیک اور پاک' میری صاف اور

ستھری رانو بیٹی! آؤ میں تمھارے ماتھے کے بجھے ہوئے چاند کو چوم لوں۔ دیکھو کہ بکائن کے اُودے اُودے پھول مہک رہے ہیں اور بیریوں پر گلہریاں تنے سے چوٹی تک بھاگی پھر رہی ہیں، اور ایسی ہوا چل رہی ہے جیسے صدیوں کے سوکھے کواڑوں سے بھی کونپلیں پھوٹ نکلیں گی، اور چار طرف تمھاری تلاوت کی گونج ہے، اور سائیں حضرت شاہ کے بھیجے ہوئے کفن کے جلنے کی بو اب تک سارے میں پھیل رہی ہے، اور میرے اندر اتنا بہت سا درد جمع ہو گیا ہے جیسے تمھیں جنم دیتے وقت جمع ہوا تھا۔

کوہ پیما

اِس پورے سلسلۂ کوہ کا تو کچھ اور ہی نام ہے مگر اس پہاڑ کا جو حصہ میرے دوست رحمت اللہ کے گاؤں ونڈی سے تین چار کوس کے فاصلے پر ہے اور جس کی ایک اہرام نما چوٹی بڑی شان سے سر اٹھائے کھڑی ہے اسے ٹکرالہ کہتے ہیں۔ میں اسی ٹکرالے اور اسی چوٹی کے بارے میں یہ سن کر بہت حیران ہوا کہ اس کی قریب سے گزرنا بھی خطرے سے خالی نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اس چوٹی پر جنات کا بسیرا ہے اور وہ اپنے اس ٹھکانے کی حفاظت کے لیے دن رات پورے ٹکرالے پر پہرہ دیتے رہتے ہیں۔ ثبوت یہ ہے کہ جو بھی بھولا بھٹکا ادھر کا رخ کرتا ہے وہ یا تو غائب ہو جاتا ہے یا اسے کسی چٹان پر سے گرا کر مار ڈالا جاتا ہے۔

رحمت اللہ کالج میں میرا ہم جماعت تھا اور ہر سال گرمیوں کی چھٹیوں میں گاؤں جاتے ہوئے وہ مجھے اپنے ساتھ لے جانے، وہاں کے پہاڑوں میں گھومنے پھرنے اور شکار کرنے کی دعوت دیتا تھا۔ میں ونڈی میں اسی سے ملنے آیا تھا مگر جب میں نے اسے دیکھا تو پریشان ہو گیا۔ وہ دو ہفتے ملیریا میں مبتلا رہنے کی وجہ سے نہایت کمزور ہو چکا تھا۔ شام کو وہ مجھے اپنی چوپال پر لے آیا۔ وہاں محفل ابھی پوری طرح جمی نہیں تھی۔ لوگ اکٹھا ہو رہے تھے اور جو موجود تھے وہ ٹولیوں میں بیٹھے باتیں کر

رہے تھے۔ میں نے اپنے قریب کی ٹولی کے ایک ادھیڑ عمر کسان کو عجیب بات کہتے سنا۔ وہ کہہ رہا تھا "اب جب میں پلٹ کر دیکھتا ہوں تو ایک دم اتنا بہت سا دھواں نکلا جیسے کوئی تنور میں سوکھے ٹانڈے جھونک دے۔ پھر یہ دھواں انسانی شکل میں بدل گیا اور پھر یہ کالا بھجنگ انسان بازو پھیلائے میری طرف بڑھا۔ میرے تو جیسے ایڑیوں اور گھٹنوں میں کسی نے بجلیاں بھر دیں۔ اتنی تیزی سے بھاگا ہوں کہ میرے ساتھ گھوڑا بھی بھاگ رہا ہوتا تو پیچھے رہ جاتا۔ اللہ نے بچایا' اس کے رسولؐ نے بچایا' پیر دستگیر نے بچایا۔ میری توبہ ہے جو جیتے جی اُدھر کا رخ بھی کروں۔ میں تو زخمی چکور کو پکڑنے کے لیے دوڑا تھا۔ وہ اڑ تو نہیں سکتا تھا پر دوڑ یوں رہا تھا جیسے کسی نے ڈھلان پر سے گیند لڑھکا دی ہے۔"

"ہو سکتا ہے وہ چکور ہی جن ہو اور تمھیں پھانسنے کے لیے جا رہا ہو!" ایک بوڑھے نے خیال ظاہر کیا۔

اور کسان کے چہرے پر ایک دم بہت سا خوف چھا گیا۔ پھر وہ کچھ یوں بولا جیسے سرگوشی کر رہا ہے۔ "ٹھیک کہتے ہو چاچا وہی ہو گا۔ دُھواں اُدھر ہی سے اٹھا تھا جدھر چکور گیا تھا۔"

"بچ گئے ہو۔ منّت مانو۔" کسی نے مشورہ دیا۔

جب چوپال کی محفل پوری طرح جم گئی تو میں نے اس آسیبی پہاڑ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ پہاڑ جسے ونڈی والے ٹکرالہ کہتے ہیں' نسل دو نسل پہلے تک عام پہاڑوں کا سا پہاڑ تھا مگر پھر اس پر جنات آ بسے۔ ایک شخص نے ایک پیڑ کی ٹہنی کاٹی تو اس میں سے خون ٹپکنے لگا اور پھر وہ جب تک زندہ رہا اس پر

مرگی کے دورے پڑتے رہے۔ ایک اور شخص نے یہاں اونٹ کو کھلا چھوڑ دیا اور خود ایک چٹان کے سائے میں پڑ کر سو گیا۔ پھر یہ اونٹ آیا اور اس پر بیٹھ گیا اور اپنے پیٹ کو اس پر اتنے زور سے رگڑا کہ اس کی ہڈیاں چُورا چُورا ہو گئیں۔ اونٹ پر جن آ گیا تھا۔ اسی طرح پے درپے اتنے واقعات ہوئے کہ آہستہ آہستہ لوگ ٹکرالے سے کترانے لگے۔ پھر ایک روز یوں ہوا کہ اس پہاڑ سے دور کسی وادی میں سے ایک عورت سر پر گٹھری رکھے ونڈی میں جنگلی بیر بیچنے آ رہی تھی مگر جب ٹکرالے کے پاس سے گزری تو جنات نے بیروں کی گٹھری اس کے سر پر سے اچک لی اور اوپر پُھلائی کے درختوں سے قہقہوں کی آوازیں آنے لگیں۔ عورت وہاں سے بھاگی اور گرتی پڑتی خون آلود گھٹنوں اور ادھڑی ہوئی کہنیوں کے ساتھ گاؤں کی مسجد میں داخل ہو گئی۔ وہاں جا کر سجدے میں گر گئی اور اتنی روئی کہ کوئی کیا رویا ہو گا۔ تب سے ونڈی کے لوگوں نے ٹکرالے کے پاس سے گزرنا تو رہا ایک طرف اُدھر دیکھنا بھی چھوڑ دیا ہے۔

ظاہر ہے یہ سراسر توہّمات کا کیا دھرا تھا۔ میں نے سوچا ان سیدھی سادے لوگوں نے خوفزدگی کے تحت اس طرح کے واقعات گھڑ رکھے ہیں۔ میں نے پکا ارادہ کر لیا کہ ٹکرالے کی چوٹی کو چپکے سے جا کر سر کروں گا اور یوں لوگوں کے توہمات کی جڑ کاٹ دوں گا۔ ان رنگ رنگ کے پتھروں اور قسم قسم کی جھاڑیوں کے علاوہ اس پہاڑ میں معدنیات بھی تو موجود ہو سکتی ہیں۔ آخر لوگوں نے کوئلہ اس پہاڑ سے ملتے جلتے دوسرے پہاڑوں میں ہی سے تو نکالا ہے۔ اسے اچھوت بنا کر یہ

لوگ صدیوں تک گھاٹے میں رہیں گے۔

میں نے تہیہ کر لیا کہ اس سفر کی پوری پوری تیاری کروں گا اور کل منہ اندھیرے ہی کوہ پیمائی کا یہ سلسلہ شروع کر دوں گا۔ میں خود ایک پہاڑی علاقے کا رہنے والا ہوں اس لیے جانتا ہوں کہ فاصلوں کے معاملے میں پہاڑ بڑا دھوکا دیتے ہیں۔ وہ دو چوٹیاں جو دور سے بظاہر قریب نظر آتی ہیں۔ دراصل ایک دوسرے سے کئی کوس کے فاصلے پر ہوتی ہیں اور راستے اتنے دشوار گزار ہوتے ہیں کہ انسان جتنی دیر میں یہاں کے دس کوس طے کرتا ہے' میدانی علاقوں میں بیس پچیس کوس طے کر جاتا ہے۔ میں اپنے ذہن میں اس کوہ پیمائی کی تفصیلیں طے کرتا رہا اور اپنے ٹھکانے پر واپس آتے ہی میں نے رحمت اللہ سے اپنا مافی الضمیر یوں بیان کیا "تمھاری علالت اور کمزوری کی وجہ سے میں نے اکیلے ہی گھومنے پھرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ صبح میں ایک دو دن کے لیے کسی بھی پگڈنڈی پر ہو لوں گا۔ پگڈنڈیاں مجھ ایسے بے منزل مسافر کی نکیلیں ہوتی ہیں۔ جہاں بھی مجھے یہ پگڈنڈی لے جائے گی۔ چلتا رہوں گا اور جب تھک جاؤں گا تو اسی پگڈنڈی کا ہاتھ پکڑ کر تمھارے پاس واپس آ جاؤں گا۔"

رحمت اللہ نے چند روز تک اپنی صحت کے بحال ہونے کا انتظار کرنے کو کہا مگر میں بضد رہا۔ وہ میرے ہمراہ ایک دو آدمی بھجوانا چاہتا تھا مگر میں نے انکار کر دیا۔ میں نے کہہ دیا کہ تم ساتھ ہوتے تو اور بات تھی مگر اب میں اپنے تجربے میں کسی غیر کو شامل نہیں کروں گا۔ رحمت اللہ آخر میرا دوست تھا' میرے مزاج کو سمجھتا تھا سو مان گیا۔ گھر

کے اندر جا کر میرے لیے دو ایک روز کا زادِ راہ تیار کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ صبح منہ اندھیرے جب میں گھر سے نکلا تو پراٹھوں' اُبلے ہوئے انڈوں' پھلوں' شہد اور بڑے سے تھرماس وغیرہ سے لدا پھندا تھا۔ ساتھ ہی میں نے ایک گرم چادر بھی اپنے سامان میں ٹھونس لی کہ رات آ گئی تو ٹھنڈک کا احتمال ہو گا۔ ساتھ ہی میں نے چپکے سے رحمت اللہ کی سرخ رنگ کی لال بشرٹ بھی سفری تھیلے میں ڈال لی کہ ٹکرالے کی چوٹی پر جا کر فتح کا جو جھنڈا گاڑوں گا وہ رحمت اللہ کی لال بشرٹ ہو گی۔ پھر سارے گاؤں کے سامنے جب یہ جھنڈا لہرائے گا اور میں صحیح سلامت واپس اتر آؤں گا تو یہ پہاڑ گاؤں والوں کے لیے "آؤٹ آف باؤنڈ" نہیں رہے گا۔ میں نے چھڑی کی بجائے ایک خاصی لمبی لاٹھی اٹھا لی تو رحمت اللہ نے مجھے ٹوکا بھی مگر اسے میرے منصوبے کا علم نہیں تھا۔ میں نے یہ کہہ کر مذاق میں ٹال دیا کہ لاٹھی جتنی طویل ہو گی سفر اتنا ہی طویل ہو گا اور طویل پیدل سفر میری زندگی کی عزیز ترین خواہشوں میں سے ایک ہے۔

میں نے یہ احتیاط برتی کہ کوئی شخص مجھے ٹکرالے کی طرف جاتا ہوا نہ دیکھے۔ دراصل میں توہمات سے لدے ہوئے لوگوں کو ایک خوشگوار "سرپرائز" دینا چاہتا تھا۔ گلیوں میں اکا دکا لوگ ملے مگر وہ سب نمازی تھے اور مسجد کی طرف جا رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے اچانک اس زور سے "السلام علیکم" کا نعرہ لگایا میں سمجھا کہ میرا راز فاش ہو گیا ہے مگر میرے اسی طرح کے دبنگ "وعلیکم اسلام" نے فضا ہموار کر دی۔

جب میں ٹکرالے کے قدموں تک پہنچا تو پو ابھی پھوٹنے کا جیسے ارادہ کر رہی تھی۔ آخر میں بھی ایک گاؤں ہی کا رہنے والا تھا اور بچپن

سے جنوں بھوتوں کی کہانیاں سنتا آ رہا تھا چنانچہ ٹکرالے کے قرب نے میری ریڑھ کی ہڈی میں ایک بار تو ٹھنڈی یخ لہر دوڑا دی مگر فوراً بعد میں نے اپنے آپ کو سرزنش کی اور آگے بڑھا۔

جب صبح خاصی روشن ہو گئی تو میں نے ٹکرالے کی بلندی کی طرف پہلا قدم رکھا۔ میں نے ونڈی کی مخالف سمت سے پہاڑ پر چڑھنے کا سلسلہ شروع کیا تھا کہ کوئی دیکھ نہ لے۔ پہاڑ انسانوں کی آمدو رفت سے محروم تھا اس لیے پگڈنڈی سے بھی محروم تھا۔ چند گز آگے بڑھنے کے لیے ذرا ذرا سے اٹکے ہوئے پتھروں سے بچ نکلنے کی کوشش میں بہت سا وقت صرف ہو گیا۔ کہیں کہیں چڑھائی معمول کے مطابق تھی مگر کئی مقامات پر عمودی سی ہو جاتی تھی اور عمودی چڑھائی چیونٹی تو طے کر لیتی ہے مگر انسان ابھی اس قابل نہیں ہو سکا۔ اس عمودی حصے کو طے کرنے کے لیے کتنے ہی چکر کاٹنے پڑتے تھے اور جب میں اپنے زعم میں بہت سا فاصلہ طے کر چکا ہوتا تھا تو یکایک مجھے وہ کانٹوں بھری جھاڑی چند گز نیچے نظر آجاتی تھی جس کے پاس سے میں آدھ گھنٹہ پہلے گزرا تھا۔

سورج ڈٹ کر نکلا تھا اور دھوپ اتنی تیز تھی جیسے شعاعیں چٹانوں میں برمے کی طرح سوراخ کر ڈالیں گی مگر پھر ٹھنڈی پہاڑی ہوا کا جھونکا آتا تھا اور سرخوشی کے عالم میں سورج کا منہ چڑانے کو جی چاہتا تھا۔ کہیں کہیں سے مجھے گاؤں کا ایک حصہ بھی نظر آیا' جس کے سامنے سبز کھیتوں کی وسیع وادی یہاں سے سبز مخمل کا دھاری دار قالین سا نظر آتی تھی مگر میں مسلسل کوشاں رہا کہ میں گاؤں کو نہ دیکھ سکوں تاکہ گاؤں والے اس وقت تک مجھے نہ دیکھ سکیں جب تک میں ٹکرالے کی

چوٹی پر سے لاٹھی کے سرے پر رحمت اللہ کی لال بشرٹ نہیں لہراتا۔

مسلسل چڑھائی میری توانائیوں کو شکست دینے پر تل گئی تھی۔ میں پسینہ پسینہ ہو رہا تھا اور بار بار تھرماس سے پانی کے دو چار گھونٹ پی لیتا تھا۔ تاہم میں نے ہمت نہ ہاری اور دوپہر کے قریب میں پہاڑ کے ایک ایسے صاف اور ہموار حصے میں تھا۔ جہاں اگر میرا بس چلتا تو اپنا صحت افزا مکان تعمیر کرا لیتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس مقام پر جو گہری سبز گھاس یہاں سے وہاں تک اگ رہی ہے' کسی مالی نے لگائی ہے اور یہاں کھاتے پیتے لوگوں کے شامیانے لگ چکے ہیں اور دعوتیں اڑ چکی ہیں۔ پھر ایک تیز جھونکے نے گھاس کے اس طویل و عریض قطعے میں جیسے جان ڈال دی۔ گھاس کی پتیاں دور تک ایک سبز لہر کی صورت میں جھکتی چلی گئیں۔ تب ایک دم مجھے جنات کا خیال آیا کہ کہیں یہ سارا طلسم ان کی شرارت کا حصہ تو نہیں ہے مگر اپنی مہم کی اہمیت کا خیال آتے ہی میں سنبھل گیا اور وہیں سبز مخمل کے اس فرش پر بیٹھ کر کھانا کھایا۔ اندر سے میں منتظر رہا کہ ابھی کوئی چیل' کوئی کوا' کوئی ممولا' کوئی لالی' کوئی چڑیا نمودار ہو گی اور مجھے دور سراسراہٹ کا احساس ہو گا مگر شاید دوپہر کی حدت کی وجہ سے وہاں کسی جاندار کا وجود نہیں تھا۔ یکایک مجھے ایک کالا کلوٹا مکوڑا نظر آگیا جو گھاس کی ایک پتی کے سرے تک پہنچ کر حیران و پریشان اِدھر اُدھر سر گھماتا تھا اور پھر وہاں سے پلٹ کر گھاس کی دوسری پتی پر چڑھنے لگتا تھا۔ میں یہ سوچ کر مسکرایا کہ وہ بھی گھاس کی چوٹی سر کرنے نکلا ہے۔

سامان سمیٹ کر میں نے ایک بار پھر کوہ پیمائی شروع کی۔ اب

میں پتھروں اور جھاڑیوں اور کھڈوں کا عادی ہو گیا تھا اور اس ماہر انجینئر کی طرح گھوم پھر کر بلندی کی طرف جا رہا تھا جو نئی پہاڑی سڑک کی منصوبہ بندی کرتا ہے۔ اب سورج مغرب کی طرف ڈھل گیا تھا۔ دھوپ کی حدت کم ہو گئی تھی اور ہوا خوشگوار حد تک خنک ہو رہی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق چوٹی کہیں قریب ہی تھی اس لیے مجھے یقین تھا کہ میں شام سے پہلے وہاں پہنچ جاؤں گا اور ممکن ہے جھنڈا گاڑ کر واپس بھی اتر آؤں کیونکہ انسان دو ہی موقعوں پر اپنی بساط سے بڑھ کر تیز رفتار ہو جاتا ہے۔ اول بلندی پر سے اترتے ہوئے اور دوم شکست کھا کر بھاگتے ہوئے۔

مگر شام قریب آ رہی تھی اور چوٹی جیسے غائب ہو گئی تھی۔ جیسے کوئی جن اسے پہاڑ سے تراش کر کہیں لے گیا تھا۔ گاؤں سے تو یہ چوٹی بے حد الگ اور مصر کے اہرام کی طرح ابھری ہوئی دکھائی دیتی تھی مگر یہاں سے اس کا محل وقوع بھی مشکوک ہو رہا تھا۔ ایک چوڑی چٹان پر بیٹھ کر میں گومگو کے عالم میں گرفتار ہو گیا۔ اگر میں چوٹی سر بھی کر لوں اور وہاں رحمت اللہ کی لال بشرٹ لہرا بھی دوں تو میں تاریخ انسانی کا کون سا کارنامہ انجام دوں گا اور پھر جیسا کہ مائیں اور نانیاں اور دادیاں صدیوں سے سناتی چلی آئی ہیں، جنات شام کے بعد ہی تو کھل کھیلتے ہیں۔ میں نے نیچے نشیب پر نظر دوڑائی تو یہاں سے واپسی کے ارادے کو فوراً منسوخ کرنا پڑا۔ یہ نشیب تو شام کی سیاہی کے سیلاب سے لبریز تھے، اور جیسے جیسے سورج مغربی افق کی طرف لٹکا جا رہا تھا، تاریکی کا یہ سیلاب بلندیوں کی طرف امڈا چلا آ رہا تھا۔

چٹان جس پر میں بیٹھا تھا اس قدر چپٹی اور صاف تھی کہ اس پر ہاتھ پھیرا تو جیسے پھسلتا چلا گیا۔ عناصر نے اس کی خوب رگڑائی کر رکھی تھی۔ رات کو آرام کرنے کے لیے یہ بہترین پڑاؤ تھا۔ جنات کی دہشت اپنی جگہ مگر گرمیوں میں شام کے بعد سانپ، بچھو، کنکھجورے وغیرہ بھی تو رنگ رلیاں مناتے ہیں اور پہاڑوں کے سانپ تو قیامت کے ہوتے ہیں۔ زہر کے سوا ان کے پاس کچھ ہوتا ہی نہیں۔ سورج ابھی ڈوبا نہیں تھا۔ روشنی تھی چنانچہ سامانِ سفر کو چٹان پر رکھ کر میں نے آس پاس کی زمین صاف کرنا شروع کی۔ جھاڑیاں اکھیڑ کر پرے پھینک دیں۔ بھاری پتھر دور لڑھکا دیے۔ زمین میں کہیں سوراخ نظر آیا تو اس میں کنکر گاڑ دیے۔ یہ تو حشرات الارض سے محفوظ رہنے کی کوشش تھی اور جن بھوت کے شر سے محفوظ رہنے کے لیے میرے پاس آیت الکرسی کا گرز موجود تھا۔ اندھیرا بڑھنے سے پہلے میں نے شام کا کھانا کھایا اور چٹان پر لیٹ کر گرم چادر تان لی۔ پھر میں آیت الکرسی کا ورد کرنے لگا۔ پھر یکایک میرے اندر جیسے اعتماد کی صلاحیت پیدا ہو گئی۔ جنات کا وہم آندھی کی زد میں آئے ہوئے خس و خاشاک کی طرح اڑ گیا اور میں نہایت سکون سے سو گیا۔

جب میری آنکھ کھلی تو سورج ابھی نہیں نکلا تھا مگر حد نظر تک پھیلا ہو منظر پو پھٹنے کے نور میں نہا رہا تھا۔ میرے جسم میں سفر کی تھکن کا شائبہ تک نہ تھا۔ جب سورج کی بالائی قوس نے مشرق سے جھانکا تو میں ناشتہ کر چکا تھا۔ اس نئی نویلی صبح نے مجھے کگرالے کی چوٹی دکھا دی۔ میں نے جس بلندی پر رات بسر کی تھی وہ اس چوٹی سے کچھ زیادہ نیچی نہیں

تھی۔ اس چٹان اور گکرالے کی چوٹی کے درمیان ایک گھاٹی تھی جو اتنی گہری تھی کہ اس میں رات پناہ گزین معلوم ہو رہی تھی۔ صبح کے نیم اجالے نے اسے بہت ہی گہرا کر دیا تھا۔ مجھے یہ گھاٹی عبور کر کے چوٹی تک پہنچنا تھا۔ اس لیے ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر میں نے رختِ سفر اٹھایا اور گھاٹی میں اترنے لگا۔ گھاٹی کی ڈھلان عمودی سی تھی۔ اترتے ہوئے اگر پاؤں کے نیچے کنکر پھسل جائے تو انسان لڑھکتا ہوا نیچے چٹانوں پر گر کر بکھر جائے' سو یہ اتار بھی بہت دیر میں طے ہوا۔ ظاہر ہے پھر اسی زاویے کی چڑھائی شروع ہو گئی اور ساڑھے آٹھ نو بجے کا وقت تھا جب میں چوٹی کے آخری پتھر پر بیٹھا تھا اور فاتحانہ انداز میں بہت نیچے ونڈی گاؤں کو دیکھ رہا تھا جس کے باشندوں کے اوہام کو میں ایک لمبی لاٹھی اور اس کے سر پر بندھی ہوئی رحمت اللہ کی لال بشرٹ کی پھڑپھڑاہٹ سے ہمیشہ کے لیے بھگا دینا چاہتا تھا۔

رحمت اللہ کا گاؤں گکرالے کے جنوب میں تھا اور میں شمال مغرب کی طرف سے پہاڑ پر چڑھا تھا تاکہ ونڈی کے چرواہے مجھے نہ دیکھ لیں۔ مگر وہاں چوٹی پر سے میں نے دیکھا کہ شمال مشرق کی طرف بھی قریب قریب ایسا ہی منظر تھا۔ لمبے فاصلوں پر ونڈی کے سے چند دیہات بھی مجھے پہاڑوں سے چمٹے ہوئے دکھائی دیئے۔ مشرق کی طرف تو مجھے جھاڑیوں کی بجائے دور تک پھیلے ہوئے اونچے اونچے درخت نظر آئے۔ وہاں بعض مقامات پر گھاس کی ہریاول اتنی گہری تھی کہ وہاں سے نظریں ہٹا لینے کے بعد بھی خاصی دیر تک یہ ہریاول پتلیوں میں رچی بسی رہتی تھی۔

میں نے سوچا گکرالے کے آس پاس چار طرف لوگ کتنے بدقسمت ہیں کہ اپنے اتنے خوبصورت پہاڑ سے خوفزدہ ہیں۔ جس کے سینے میں نہ جانے کیا کیا خزانے پوشیدہ ہیں اور جس کے شمالی اور مشرقی جانب کی بالائی سطح کشمیر کا ٹکڑا نظر آتی ہے۔ ظاہر ہے رحمت اللہ کی لال بشرٹ کا یہ جھنڈا ونڈی کے علاوہ چار طرف نظر آئے گا اور ان سب علاقوں کے اوہام کا خاتمہ کر دے گا۔

لاٹھی کے ساتھ میں نے بشرٹ کے بازو مضبوطی سے باندھے۔ لاٹھی گاڑنے کے لیے کمانی دار چاقو کھول کر کھدائی شروع کی۔ پھر جب ایک خاصا گہرا سوراخ کھد گیا تو میں نے اس میں لاٹھی گاڑ دی اور رحمت اللہ کی لال شرٹ ٹھنڈی ہوا میں زور زور سے پھڑپھڑانے لگی۔

مگر خود آسودگی اور تسکین کے یہ لمحے مختصر ثابت ہوئے۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کسی کے گانے کی آواز آ رہی تھی۔ ظاہر ہے یہاں اس ویرانے میں جہاں انسان کا گزر نہیں یہ کسی غیر انسانی مخلوق ہی کی آواز ہو گئی۔ آواز سریلی تھی اور زنانہ لگتی تھی۔ سو یہ کسی پری کی بھی ہو سکتی تھی۔

میں گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ رحمت اللہ کی پھڑپھڑاتی بشرٹ نے جیسے میرے منہ پر تین چار طمانچے دے مارے۔ میں بھاگ نہیں سکتا تھا کیونکہ نیچے ونڈی تک جانے کے لیے پورا دن درکار تھا۔ ہار بھی نہیں مان سکتا تھا کہ یہ اپنی خود اعتمادی کو ذبح کر دینے کے مترادف تھا۔ سو میں نے طے کیا کہ جو ہو سو ہو' اس آواز کا منبع ضرور ڈھونڈوں گا۔ بشرٹ کی پھڑپھڑاہٹ گانے کی آواز میں حارج ہو رہی تھی مگر میں نے اس کی سمت

معین کر لی تھی چنانچہ میں کوئی کھٹکا کیے بغیر' بڑی احتیاط کے ساتھ مشرق کی طرف نیچے اترنے لگا۔ مسلسل آواز آ رہی تھی۔ ساتھ ہی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بیٹھا نیچے نشیب میں کنکر گرا رہا ہے۔ یہ کنکر چٹانوں پر ٹھا ٹھا بجتے ہوئے نیچے گرتے چلے جاتے تھے اور پھر وہ رک جاتے تھے یا دوری کی وجہ سے ان کی آواز مر جاتی تھی۔ کل دن اور رات کے سناٹے کے بعد آج یہ گانے اور کنکر گرانے کی آوازیں مجھے قطعی طور پر غیر انسانی محسوس ہو رہی تھیں۔

پھر جیسے میرے پاؤں جکڑے گئے۔ چند گز کے فاصلے پر ایک درخت کے تنے کے ساتھ لگا ایک لڑکا بیٹھا تھا۔ وہی گا بھی رہا تھا اور بے خیالی میں کنکر بھی گرا رہا تھا۔ اس خوف سے کہ میں اس کے سامنے جاؤں تو یہ لڑکا جانے کیا کیا شکلیں اختیار کرنے لگے' میں وہاں ٹھٹکا کھڑا رہا۔ ایک بار ہمت کر کے کھنکارا تو لڑکے نے گانا روک کر اور پلٹ کر مجھے دیکھا۔ ایک بار تو میں سناٹے میں آ گیا۔ جنات کی تخلیق آگ سے ہوئی ہے اس لیے بزرگوں کے انکشاف کے مطابق ان کے چہرے اور بال سنہرے رنگ کے ہوتے ہیں۔ مگر کیا کوئی جن اتنا خوبصورت بھی ہو سکتا ہے!

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ "کون ہو تم؟ جنگل کے داروغے ہو؟"

"تم کون ہو؟" میں نے آواز میں خوف کی لرزش چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

"میں؟" وہ بولا "میں نور الٰہی ہوں۔ اللہ دین چرواہے کا بیٹا

ہوں۔ تیسری جماعت میں پڑھتا ہوں۔ بابا کچھ بیمار ہے۔ اس لیے میں نے سکول سے دس دن کی چھٹی لے لی ہے۔ وہ نیچے گھاس کے میدان میں سفید سفید کالے کالے دھبے دیکھ رہے ہو۔ یہ ہماری بھیڑیں بکریاں ہیں۔ تم کیا کرتے پھر رہے ہو۔"

میرے حواس ٹھکانے آ رہے تھے مگر اس سوال کا جواب دینے کی بجائے میں نے پوچھا "تم ہر روز یہاں آتے ہو؟"

"ہاں" وہ بولا "کیوں ایسا کیوں پوچھتے ہو؟"

میں نے اس سوال کے جواب میں پھر سوال کر دیا۔ "تمھارا گاؤں یہاں سے کتنی دور ہے؟"

"جتنی دور اِدھر دکن والا ونڈی گاؤں ہے اور اُدھر اُتر والا جھموٹا۔ میرے گاؤں کا نام رنگ پور ہے۔ یہ اِدھر والا سارا پہاڑ ہمارے گاؤں کا ہے۔ تم کس گاؤں سے آئے ہو؟"

میں نے پھر سے سوال کے جواب میں سوال پوچھا "تمھیں ڈر نہیں لگتا اکیلے میں؟ اس ویرانے میں؟"

وہ ہنس دیا پھر بولا۔ "کیوں ڈر لگے؟ کس سے ڈر لگے؟"

پھر اس کی نظر دور لاٹھی کے سرے سے بندھی پھڑپھڑاتی ہوئی بشرٹ پر جا پڑی اور اس نے پوچھا۔ "وہ قمیض تمھاری ہے؟"

میں نے کہا "ہاں کیوں؟"

اور لڑکا ٹن ٹن ہنستا ہوا بولا۔ "میں نے پہلی بار کسی کو اس طرح کپڑے سکھاتے دیکھا ہے!"

✱

چبھن

کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس عمر میں شمشاد علی کو خدا سے لو کیسی لگ گئی ہے۔ وہ مبالغے کی حد تک وجیہہ نوجوان تھا۔ جدھر سے گزرتا تھا اسے لوگ دیکھتے کے دیکھتے رہ جاتے تھے۔ نئی نئی داڑھی مونچھوں کے بالوں میں کہیں کہیں سنہرے بال کوندے کی طرح لپک لپک جاتے تھے۔ آنکھوں کی پتلیوں کا رنگ گہرا بادامی تھا مگر کبھی کبھی وہ نیلی نیلی سی لگتی تھیں۔ اسے لوگوں نے گھر سے مسجد کی طرف جاتے ہوئے یا مسجد سے گھر کی طرف جاتے ہوئے بار بار دیکھا تھا مگر وہ اس کے علاوہ کہیں نظر نہیں آتا تھا۔ مسجد میں دیر دیر تک بیٹھا رہتا۔ بڑے بھائیوں نے اس خوف کے مارے، کہ کہیں شمشاد علی مجذوب ہو کر ہی نہ رہ جائے، اس کی شادی بھی کر دی تھی اور وہ ایک بیٹے کا باپ بھی ہو گیا تھا مگر بیٹے سے اس کا پیار اس سے آگے شاذ ہی بڑھ سکا کہ وہ وظائف پڑھنے کے بعد اٹھتا اور بیوی کی گود میں یا پنگوڑے میں سوئے ہوئے بیٹے کے پورے جسم پر ایک لمبی "چھوہ" سے جیسے وظائف کا سارا ثواب انڈیل دیتا اور پھر مسجد کی راہ لیتا۔ کئی بار اسے بھائیوں بہنوں کے

درمیان بٹھا کر سمجھایا گیا کہ تلاوت و وظائف اپنی جگہ مگر زندہ انسانوں کو اس کے علاوہ بھی بہت کچھ کرنا پڑتا ہے اور وہ ایک بیوی کا شوہر اور ایک بیٹے کا باپ بھی ہے اور ان کے چند فرائض بھی اس پر عاید ہوتے ہیں، مگر وہ ایک ادھوری سی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے بیٹھے رہتا اور جب سب اٹھ کر جانے لگتے تو وہ بھی اٹھتا اور سیدھا مسجد پہنچ جاتا۔ سردیوں کے موسم میں وہ ٹھنڈے پانی سے وضو کرنے پر بضد رہتا اور اسے بھی عبادت کا ایک حصہ سمجھتا۔ وہ بیوی کا لایا ہوا گرم پانی کا کوزہ ایک طرف رکھ دیتا۔ اس کی ایڑیوں میں دراڑیں پڑ جاتیں اور ہاتھوں کی پوریں پھٹ جاتیں مگر ایک ازلی ادھوری مسکراہٹ سے اس کے ہونٹ ہر حال میں سجے رہتے اور اس کا وظیفہ حیات جاری رہتا۔

شمشاد علی پیروں کے خاندان کا ایک فرد تھا مگر ان پیروں کی گدی اس گاؤں سے دور ونڈی شیخاں میں تھی۔ اس کے بڑے بھائی امجد علی گدی نشین تھے۔ وہ جب بھی ونڈی شیخاں سے اپنے گاؤں میں آتے، اپنے چھوٹے بھائی کو یاد الٰہی میں اس حد تک سرشار دیکھ کر فکر مند ہو جاتے۔ آخر ایک روز دوسرے بھائیوں سے مشورے کے بعد انھوں نے طے کیا کہ شمشاد علی کو ونڈی شیخاں لے جانا چاہیے اور اگر وہ تلاوت و وظائف میں کمی پیدا کرنے کو کسی صورت میں تیار نہیں ہوتا تھا تو اسے وہاں آبائی خانقاہ میں بٹھا دینا چاہیے۔ ممکن ہے دن بھر مریدوں کی آمد و رفت سے اس کی توجہ ہٹے اور وہ اپنے برادر بزرگ امجد علی کے کسی کام آ سکے۔ جب اسے بتایا گیا کہ بھائی اسے خانقاہ بھیج رہے ہیں تو وہ بولا۔ "ٹھیک ہے ——— لے چلئے -- خدا بھی ہر جگہ وہی ہے اور

قرآن بھی ہر جگہ وہی ہے۔ مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔"

وِنڈی شیخاں میں اسے مزار کی ایک طرف ایک گدے پر بٹھا دیا گیا اور وہ وہاں بیٹھتے ہی اپنے روز کے معمول میں مصروف ہو گیا۔ مریدوں کو جب معلوم ہوا کہ یہ چھوٹے پیر جی ہیں تو مارے عقیدت کے اس پر ٹوٹ پڑے۔ اس کے ہاتھوں کو اتنا چوما کہ وہ بھیگ گئے اور اسکے گھٹنوں کو اتنا چھوا کہ اس کی سفید شلوار جگہ جگہ سے میلی ہو گئی مگر وہ وظائف پڑھتا رہا اور مریدوں کی عقیدت مندی کے ساتھ بے نیازی کا سلوک کرتا رہا۔ ایک دو بار صرف اتنا کہا کہ قبلہ بھائی جان تو کہیں اُدھر بیٹھے ہیں مگر جب مریدوں کا تانتا ٹوٹنے ہی کو نہ آیا تو وہ چپکا ہو رہا اور اپنے کام سے کام رکھا۔

اس دوران اس نے دیکھا کہ جس گدے پر وہ بیٹھا تھا' اس کا ایک کونا مرید اٹھاتے ہیں اور پھر رکھ دیتے ہیں۔ وہ سمجھا یہ بھی ان کی عقیدت کا کوئی رخ ہو گا' مگر جب شام کے بعد بھائی جان اسے لینے آتے تو ان کے ایک خادم مبارک خان نے گدے کے سب کونے اٹھا کر بہت سے کرنسی نوٹ سمیٹ لیے۔ شمشاد علی اس وقت ذرا کھل کر مسکرایا اور بولا "میں سمجھا وہ لوگ گدے کو بھی میرے ہاتھوں اور گھٹنوں کی طرح چھو رہے ہیں۔ اب پتہ چلا کہ وہ تو مجھے نذرانے دے رہے تھے۔"

بھائی جان نے اسے ٹوکا۔ "یہ نذرانے تمھیں نہیں دئے گئے شمشاد علی' یہ خانقاہ شریف کا مال ہے۔ یوں سمجھو کہ یہ مال تمھاری معرفت خانقاہ شریف کو ملا ہے۔ تمھیں اس کا بہت بڑا ثواب پہنچے گا۔"

"مجھے بھی ملتے تو میں ان کا کیا کرتا۔" شمشاد علی بولا۔ "میری تو

سب ضرورتیں میرا پروردگار پوری کرتا ہے۔ میں کل سے مریدوں سے کہوں گا کہ میرے گدے کو مت چھوؤ اور نذرانہ دینا ہے تو بھائی جان کے پاس جاؤ۔"

"نہ نہ کہیں یہ نہ کر بیٹھنا" بھائی جان بولے۔ "میری معرفت جو نذرانے آتے ہیں وہ الگ ہیں۔ تمھاری معرفت جو آتے ہیں وہ الگ ہیں —— ایسا کہہ کر کیوں خانقاہ شریف کی آمدنی میں کمی کا ارتکاب کرتے ہو۔"

"جی اچھا" شمشاد علی بولا —— "مگر خانقاہ شریف کی آمدنی آپ ہی کے پاس جمع ہو گی نا؟"

"جیسا میں نے کہا ہے ویسا ہی کرتے رہو" بھائی جان نے کسی قدر ناگواری سے کہا —— "اس روپے پیسے کے جھگڑے میں نہ پڑو۔ ایمان خراب ہو گا۔"

"جی اچھا۔" شمشاد علی یوں بولا جیسے ڈر گیا ہے۔

جب خانقاہ پر آنے والے مریدوں نے اپنے اپنے دیہات میں جا کر بتایا کہ وہاں بڑے پیر جی کے چھوٹے بھائی آئے ہیں اور ان کے چہرے پر اتنا نور ہے کہ لگتا ہے کوئی فرشتہ بیٹھا ہے' تو خانقاہ شریف پر آنے والوں کی قطاریں لگ گئیں۔ وہ امجد علی کو جلدی جلدی سے نذرانے پیش کرنے کے بعد شمشاد علی کے پاس آتے اور اسے غور سے دیکھتے تو یوں آنکھیں ملنے لگتے جیسے چندھیا گئی ہیں۔ پھر نہ صرف گدے کے کونے اٹھتے رہتے بلکہ بعض زیادہ محتاط مرید تو شمشاد علی کے کرتے کی جیب میں بھی نوٹ ٹھونس جاتے۔ شام کو مبارک خاں' امجد علی کے

سامنے گدے کے نیچے سے اور شمشاد علی کی جیب کے اندر سے نوٹ نکال لیتا۔ پھر دونوں الگ کمرے میں جا کر گنتی کرتے اور مسکراتے کہ شمشاد علی کی برکت سے خانقاہ شریف کی آمدنی دگنی ہو چلی ہے۔

گندم کی فصل اٹھنے کے فوراً بعد جب خانقاہ شریف میں سالانہ عرس کی تقریب برپا ہوتی تو علاقے کے طول و عرض سے مرید نذرانوں کی رقموں سے لدے پھندے خانقاہ شریف کا رخ کرتے اور امجد علی اور شمشاد علی کو کرنسی نوٹوں سے لاد جاتے۔ ایک عرس کے موقعے پر تو مریدوں کے ریلے کی وجہ سے شمشاد علی کی جیب ہی پھٹ گئی۔ تب وہاں گنجائش نہ پا کر ایک مرید نے ایک نوٹ شمشاد علی کے ہاتھ میں تھمانا چاہا مگر اس نے نوٹ کو یوں جھٹک دیا جیسے اسے بھڑ نے کاٹا ہے۔ پھر اس نے نوٹ تھمانے والے مرید کو اتنی ناگواری سے دیکھا کہ وہ خوف کی مارے کانپنے لگا۔ تب وہ اٹھا' مرید کے سر پر ہاتھ پھیرا' اسے سینے سے لگایا اور بولا۔ "مجھے معاف کر دو بھائی۔ میں سمجھا تم یہ روپیہ مجھے دے رہے ہو اور مجھے تو روپے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ میری ضرورتیں تو میرا پروردگار پوری کرتا ہے۔ یہ خانقاہ شریف کا روپیہ ہے اس لیے میرے ہاتھ میں نہ دو۔ کسی کے بھی ہاتھ میں نہ دو۔ اس طرح روپیہ بھی لینے والے کے ہاتھ کی طرح پلید ہو جاتا ہے"

اس واقعے نے شمشاد علی کی بزرگی پر تصدیق کی مہر ثبت کر دی اور اس کے گرد اتنا ہجوم رہنے لگا کہ بعض اوقات پیر امجد علی گھبرا جاتے۔ وہ سوچتے کہیں پانسہ الٹا ہی نہ پڑ جائے۔ مگر پھر جب دیکھتے کہ مبارک خاں ہر روز شمشاد علی کے ہاں سے نوٹوں کے پلندے سمیٹ کر لا

رہا ہے تو چپکے ہو رہتے ———

ایک رات جب مبارک خاں نذرانے سمیٹ کر لے جا چکا تو شمشاد علی نے دیکھا کہ گدے کے ایک کونے کے نیچے سے دس روپے کے نوٹ کا ایک حصہ جھانک رہا ہے۔ کندھے پر سے رومال اتار کر ہاتھ پر لپیٹا اور پھر اس ہاتھ سے نوٹ اٹھا کر بھائی جان کی بیٹھک کا رخ کیا۔ دروازہ کھولا تو پیر امجد علی کے سامنے ایک سو اور پچاس اور دس اور پانچ اور دو اور ایک روپے کے نوٹوں کی الگ الگ ڈھیریاں لگی تھیں اور مباک خاں ان کے گنتی کر رہا تھا۔ شمشاد علی کی یہ مداخلت پیر امجد علی کو بہت ناگوار گزری۔ وہ بولے "تمھارا کمرہ تو اُدھر اُس طرف ہے شمشاد علی۔ ادھر کیا کرنے آئے ہو؟"

مبارک خاں بھی جس رخ بیٹھا تھا' بیٹھا رہ گیا۔

شمشاد علی بولا۔ "مبارک خاں یہ نوٹ وہاں خانقاہ شریف پر بھول آیا ہے ——— سوچا دے آؤں"

پیر امجد علی کے اعصاب کا تناؤ کچھ کم ہوا۔ "رکھ دو یہاں۔"

شمشاد علی نے نوٹ مبارک خان کو تھما دیا۔ پھر نوٹوں کی ڈھیریوں کے پاس بیٹھ گیا۔ انھیں غور سے دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔ "یہ ساری رقم خانقاہ شریف کی ہے نا بھائی جان؟"

"ہاں" پیر احمد علی پر پھر سے ناگواری کا حملہ ہوا۔

"یہ آپ کہاں خرچ کرتے ہیں بھائی جان؟" شمشاد علی نے بچوں کی طرح پوچھا۔

اور پیر امجد علی بولے۔ "یہ جو دن رات کا لنگر چل رہا ہے اور

یہ جو دور دور سے آنے والے معزز مہمانوں کی خاطر مدارات ہوتی ہے اور یہ جو ہم نے مسکینوں اور بیواؤں کے وظیفے مقرر کر رکھے ہیں اور سالانہ عرس پر یہ جو ایک لاکھ کے قریب اٹھ جاتا ہے تو یہ ——"

"مگر بھائی جان - مجھے حساب نہیں آتا۔ اندازے سے کہتا ہوں کہ عرس پر دو ڈھائی لاکھ کے نذرانے تو ضرور آجاتے ہوں گے۔" شمشاد علی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

اور پیر امجد علی اسے گھورتے ہوئے بولے۔ "میں نے کہا نہیں تھا کہ روپے پیسے کے جھگڑے میں مت پڑو۔ اس سے ایمان خراب ہوتا ہے۔"

اور شمشاد علی ایک ایسے بچے کی طرح وہاں سے کھسک آیا جس کی کوئی فاش غلطی پکڑی گئی ہو ——

سردیوں کے موسم میں ایک روز پیر امجد علی کو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ درجنوں مرید شمشاد علی کے خالی گدے کے آس پاس کھڑے کھسر پھسر کر رہے ہیں۔ "چھوٹے حضرت جی کی طبیعت کچھ خراب معلوم ہوتی ہے قبلہ" ایک مرید بولا۔ "ابھی اٹھ کر اپنے کمرے میں گئے ہیں پر لڑکھڑا رہے تھے اور جھکے ہوئے تھے۔"

پیر امجد علی جب شمشاد علی کے کمرے میں پہنچے تو وہ مارے درد کے بل پر بل کھا رہا تھا اور کھانس رہا تھا اور ہانپ رہا تھا۔ پیر امجد علی ساری کیفیت معلوم کرکے اس نتیجے پر پہنچے کہ شمشاد علی ذات الجنب میں مبتلا ہو گیا ہے۔ ایک حکیم سے چند دوائیں لے کر انھوں نے شمشاد علی کو فوراً اپنے آبائی گاؤں لے جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ نمونئے کو موت کا

پیغام سمجھتے تھے۔ اس لیے چاہتے تھے کہ آخری وقت میں شمشاد علی کی بیوی اور بچے اس کے سامنے رہیں اور یہ الزام ان کے سر نہ آئے کہ انھوں نے پردیس میں اپنے ہردلعزیز بھائی سے جل کر اسے مار ڈالا۔

شمشاد علی کو اس کے گھر میں جونہی چارپائی پر لٹایا گیا اور اس نے دائیں طرف کی کروٹ لی تو وہ ایک دم سیدھا ہو گیا اور بولا۔ "چبھن سی ہو رہی ہے۔"

پیر امجد علی بولے —— "نمونیے میں چبھن تو ہوتی ہے، بلکہ ٹیسیں اٹھتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ رحم کرے گا۔"

دوسرے دن صبح کو جب وہ شمشاد علی کا مزاج پوچھنے آیا تو شمشاد علی نے انھیں بتایا کہ اس نے جب بھی دائیں کروٹ پر لیٹنا چاہا، اس کے پیڑو میں ایسی چبھن ہوئی جیسے چھری کی نوک چبھ رہی ہو۔ حکیم نے آکر اس کے جسم کے دائیں حصے کا بغور جائزہ لیا مگر کسی پھوڑے پھنسی کا نشان بلکہ گمان تک نہ تھا۔ حکیم نے اپنے سامنے شمشاد علی کو دائیں کروٹ بدلنے کو کہا۔ اس نے کروٹ بلدی اور بولا۔ "چبھن میں کوئی کمی نہیں آئی۔"

حکیم نے پیر امجد علی کی طرف کچھ اس طرح دیکھا جیسے مرض کو سمجھ گیا ہو۔ پھر پیر جی کو الگ لے جا کر سرگوشی کی۔

"میں اسے موت کی چبھن کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"مگر حکیم صاحب" پیر امجد علی بولے۔ "یہ چبھن اسے بائیں کروٹ میں کیوں محسوس نہیں ہوتی؟"

اور حکیم اچانک صوفی بن گیا۔ "میت کو قبر میں دائیں کروٹ

لٹایا جاتا ہے تاکہ اس کا منہ قبلے کی طرف رہے۔ چھوٹے پیر جی کو دائیں کروٹ پر چبھن اس لیے محسوس ہوتی ہے کہ ابھی وہ ذہنی طور پر انتقال فرمانے کو تیار نہیں ہیں —— ورنہ اور کیا وجہ ہو سکتی ہے۔"

اس سے اگلے دن جب خاندان کے سب بڑے بوڑھوں نے فیصلہ سنایا کہ شمشاد علی کا آخری وقت قریب ہے اور عن قریب اس کی روح پرواز کر جائے گی' تو طے پایا کہ حاضر لوگ سورۃ یٰسین کا ورد کریں اور شمشاد علی کا منہ قبلے کی طرف کرنے کے لیے اسے دائیں کروٹ لٹایا جائے۔ جونہی شمشاد کے جسم کو دائیں طرف موڑا گیا' وہ تڑپ اٹھا اور بولا۔ "چبھن ——"

گاؤں کے مولوی صاحب اس کے جسم کے دائیں حصے کے نیچے اپنا ہاتھ لے گئے اور پھر ہاتھ کو اِدھر اُدھر گھمایا۔ اچانک انھوں نے مشورہ دیا کہ شمشاد علی کو چت لٹایا جائے۔ پھر انھوں نے اس کی جیب میں سے بہت سے کرنسی نوٹ نکالے جو تہہ در تہہ مڑنے کی وجہ سے کنکر کا سا روپ دھار گئے تھے۔

تب شمشاد علی آہستہ آہستہ بولا۔ "اچھا تو مجھے یہ روپے چبھ رہے تھے" پھر اس کے ہونٹوں پر وہ ادھوری مسکراہٹ نمودار ہوئی جو اس کی شخصیت کا ایک حصہ تھی۔ اس نے امجد علی کی طرف یوں دیکھا جیسے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ امجد علی اس پر جھکے تو وہ بولا۔ "شکر ہے بھائی جان' میرا ایمان محفوظ رہا۔ آپ اس کے گواہ ہیں۔۔"

✺

اخبار نویس

حاتم نے عباس کی ایک نہ مانی اور اس کے بازو میں بازو پھنسا کر یوں چلنے لگا جیسے گرفت ذرا سی ڈھیلی ہوئی تو عباس واپس بھاگ جائے گا۔

"تم چلو تو سہی" حاتم کہہ رہا تھا۔" سیٹھ کو صاف صاف اپنی شرائط بتا دینا۔ وہ ضرورت مند ہے۔ مان جائے گا۔ آخر اس نے روزنامہ "عدل" خرید رکھا ہے۔ جب تک اسے کوئی معقول ایڈیٹر نہیں ملتا' وہ اخبار کو مارکیٹ میں نہیں لانا چاہتا اور اِس وقت وہ معقول ایڈیٹر تمھی ہو۔ تم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ اتنے دنوں سے بیکار پڑے ہو۔ بیکار آدمی تو اکیلا بھی ہو تو خودکشی کی سوچنے لگتا ہے اور تم تو بال بچوں والے ہو۔"

عباس پہلے تو ایک طرح سے گھسٹتا چلا گیا۔ پھر معمول کی رفتار اختیار کر لی مگر اس کا احتجاج جاری رہا۔ "میں ایسے لوگوں کے ساتھ کام نہیں کر سکتا حاتم' جو انسان کو اپنی بساط کا مہرہ سمجھتے ہیں۔ ٹھیک ہے۔ صحافت سے میرا روزگار بھی وابستہ ہے مگر میں صحافت میں ممکن حد تک دیانت کو شامل سمجھتا ہوں اور اگر میں نے دیانت سے کام لے کر سیٹھ

کے اخبار میں لکھنا شروع کر دیا تو وہ تو مجھے ایک دن بھی برداشت نہیں کرے گا۔ تم خواہ مخواہ کا تکلف کر رہے ہو۔ مجھے معلوم ہے تم سیٹھ کے دوست ہو مگر سیٹھ کے ذھن میں اس دوستی کی بھی کوئی قیمت ضرور مقرر ہو گی ورنہ تم تو اپنے درمیانے طبقے کے آدمی ہو۔ اس طبقے کے لوگوں کو اونچے طبقے والے دوست نہیں رکھتے۔ وہ ان سے صرف کام لیتے ہیں۔ وہ صرف نٹ بولٹ کسنے کے کام آتے ہیں۔"

حاتم اس کی گفتگو سنتا رہا اور مسکراتا رہا۔ پھر وہ سیٹھ کے محل کے طویل و عریض صدر دروازے میں سے گزر کر جب پورچ میں پہنچے تو عباس نے وہاں ایک ایسی موٹر کار کھڑی دیکھی جو اس سے پہلے اس نے ٹی وی پر اس وقت دیکھی تھی جب برطانیہ کی ملکہ الزبتھ کینیڈا کے دورے پر گئی تھی اور ہوائی اڈے سے اپنی قیام گاہ تک ایسی ہی موٹر کار میں سوار ہوئی تھی۔ یہ ایک کار دو کاروں پر مشتمل معلوم ہوتی تھی۔ عباس نے سوچا کہ اگر ایسی کار میں صرف ایک آدمی سفر کر رہا ہو تو وہ بے چارہ کتنا اکیلا اکیلا لگتا ہو گا۔

جب وہ سیٹھ کے ڈرائینگ روم میں داخل ہوئے تو عباس چکرا کر رہ گیا۔ انسان نے اب تک جتنے بھی رنگوں کا کھوج لگایا ہے' وہ سب اس لمبے چوڑے کمرے کے پردوں' صوفوں' کشنوں اور غالیچوں میں استعمال کر دیے گئے تھے۔ حد یہ کہ مرکزی میز پر جو ایش ٹرے اور سگریٹ کیس رکھے تھے' وہ بھی قوس قزحی رنگوں سے آراستہ تھے۔ حاتم نے عباس کو پیش کرنے کے لیے ایک سگرٹ کیس کا ڈھکنا اٹھایا تو پیانو کے سریلے سر بجنے لگے۔ تب عباس نے کہا۔۔ "یہ سگرٹ کیس تو بانگ

دہل اعلان کر رہا ہے کہ لیجئے سیٹھ صاحب' آپ کو ایک اور سگرٹ کا خسارہ ہوا۔"

عباس نے اس توقع سے حاتم کی طرف دیکھا کہ وہ بے اختیار ہنس دے گا مگر وہ تو انتہا سے زیادہ سنجیدہ ہو رہا تھا۔ پھر اس نے بھویں اچکا کر صوفوں پر بیٹھے ہوئے دو لوگوں کی طرف اشارہ کیا اور زبانِ بے زبانی سے التجا کی کہ اتنی بے تکلفی مت برتو اور یہ بھی دیکھو کہ تم یہاں اکیلے نہیں ہو۔ سیٹھ صاحب کے دوسرے مہمان بھی بیٹھے ہیں۔ عباس نے مہمانوں پر ایک نظر ڈالی کہ شاید ان میں سے کوئی مسکرا رہا ہو' مگر سب پتھر کے بت بنے بیٹھے تھے۔ ماحول کی اس سنگینی سے عباس کے منہ کا ذائقہ تلخ ہو گیا۔ بولا۔ "یار۔ یہاں سادے پانی کا ایک گلاس مل سکے گا؟"

اتنے میں ایک باوردی ملازم طشت میں سبز اور گلابی اور سنہری اور سفید مشروبات کے گلاس رکھے آیا۔ عباس نے ایک گلاس اٹھا تو لیا مگر پھر استفہامیہ نظروں سے حاتم کی طرف دیکھا۔ تب حاتم مسکرایا اور بولا۔ "عام شربت ہے بھئی۔ گھور گھور کر کیا دیکھ رہے ہو؟"

"عام شربت ہے؟" ایک مہمان نے حیرت سے دوسرے مہمان کو دیکھا اور دونوں نے بھرے ہوئے گلاس طشت میں واپس رکھ دیے۔

عباس ان کی مایوسی دیکھ کر بہت محظوظ ہوا اور اپنا گلاس مہمانوں کو جیسے دکھا دکھا کر غٹا غٹ پی گیا۔ یہ بادام یا الائچی یا ایسی ہی کسی چیز کا شربت تھا۔

حاتم کہیں اندر چلا گیا تھا۔ چند منٹ کے بعد واپس آیا تو بولا۔

"سیٹھ صاحب نہا رہے ہیں۔ مگر انھوں نے فرمایا ہے کہ ہم دونوں ان کے بیڈروم میں آکر بیٹھ جائیں۔ وہ ابھی تھوڑی دیر میں نکلتے ہیں۔"

حاتم اور عباس کئی کمرے اور برآمدے اور گیلریاں اور راہداریاں عبور کرتے ہوئے سیٹھ کی خواب گاہ تک پہنچے۔ اس خواب گاہ کا رقبہ اتنا تھا کہ اگر اتنا رقبہ کسی ہما شما کے پاس ہو تو وہاں تین چار کمروں کا گھر تعمیر کرلے۔ پلنگ اتنا بڑا تھا کہ اس پر ایک وقت میں نصف درجن انسان استراحت کر سکتے تھے۔ اس پر جن کشنوں کے انبار لگے تھے۔ ان پر بھی رنگوں کی آندھیاں چل رہی تھیں۔ ایک طرف چھ یک نشستی صوفے نیم دائرے میں رکھے تھے۔ ایک پر ایک سوٹڈ بوٹڈ صاحب بیٹھے سگار پی رہے تھے۔ حاتم اور عباس نے سلام کیا تو انھوں نے سر کی نہایت خفیف جنبش سے جواب دیا۔ عباس یہ سمجھا کہ یہی سیٹھ صاحب ہیں اور نہانے کے بعد کپڑے بدل کر ملاقات کے لیے تشریف فرما ہیں، ورنہ کوئی بھی دوسرا آدمی سلام کے جواب میں سر کو اتنی ذرا سی جنبش نہیں دیتا جیسے کوئی جنبش ہوئی ہی نہ ہو۔

عباس مسلسل حاتم کی طرف دیکھ رہا تھا کہ وہ گفتگو کا آغاز کرے تو بات آگے بڑھے، مگر حاتم کی نظریں کسی اور طرف تھیں۔ تب اچانک ایک دروازہ کھلا اور سیٹھ صاحب ایک قد آدم تولیہ لپیٹے کمرے میں تشریف لے آئے۔ حاتم اور عباس کھڑے ہوئے تو سگار پینے والے صاحب ان سے بھی زیادہ عجلت سے کھڑے ہو گئے اور سیٹھ نے پہلے انھیں مخاطب کیا۔ "کیسا رہا سگار؟"

وہ صاحب بولے۔ "سگار کیا پی رہا ہوں قبلہ، شہد کے گھونٹ

پی رہا ہوں"

سیٹھ ہنسا۔ "مگر سگار کی سی لطیف تلخی شہد میں کہاں۔"

اور صاحب بولے۔ "آپ کی یہ بات تو سنٹ پر سنٹ ٹھیک ہے۔"

پھر سیٹھ اِدھر متوجہ ہوئے۔ "اچھا تو حاتم، یہ ہیں ایڈیٹر صاحب؟"

حاتم بولا۔ "جی ہاں۔ یہی ہیں۔ عباس احمد نام ہے۔"

"نام تو ان کا میں نے بھی سن رکھا ہے۔" سیٹھ نے ہنستے ہوئے کہا۔ پھر عباس سے مصافحہ کیا اور اپنے مہمان کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ "آپ رانا فروغ احمد خان ہیں۔ انکم ٹیکس کمشنر ہیں۔ میرے بہت قریبی دوست ہیں۔ ان کے سامنے گفتگو کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔ مگر گفتگو شروع کرنے سے پہلے ——" رک کر سیٹھ نے دیوار پر نہ جانے کون سی جگہ کو انگوٹھے سے دبایا کہ پوری دیوار چھت تک یوں کھل گئی جیسے یہ دیوار نہیں تھی، کپڑے کا پردہ تھا۔ اوپر سے نیچے تک اور یہاں سے وہاں تک رنگ رنگ کی شراب کی بوتلیں قطار اندر قطار سجی کھڑی تھیں۔

سیٹھ نے پہلے عباس سے پوچھا۔ "کہئے کون سی میک پسند ہے؟"

حاتم فوراً بولا "جی یہ عباس وسکی نہیں پیتا۔"

اور عباس ہکلایا۔ "میں تو صاحب ابھی ابھی آپ کے ڈرائنگ روم میں الائچی یا کسی ایسی ہی چیز کا شربت پی کر آرہا ہوں۔"

سیٹھ نے سقف شگاف قہقہہ لگایا۔ "اس کے باوجود آپ جرنلسٹ ہیں!"

عباس بولا۔ ”جی ہاں۔ اس کے باوجود میں جرنلسٹ بھی ہوں اور ایک ہوش مند انسان بھی ہوں۔“

کمرے پر جیسے ایک دم سناٹا قیامت کی طرح ٹوٹ پڑا۔ سیٹھ کے ہونٹ یوں سختی سے بھنچ گئے جیسے خود کو کچھ کہنے سے روک رہا ہے۔ مہمان صاحب کی آنکھوں میں تو جیسے خون اتر آیا تھا اور حاتم غصے سے عباس کو گھور رہا تھا۔

مگر پھر سیٹھ ایک دم مسکرانے لگا اور خوش مزاجی پر اتر آیا۔

”جرنلسٹ اگر بے تکلف نہ ہو تو اسے جرنلسٹ ہی نہیں کہنا چاہیے۔ آپ کی یہ بات سن کر مجھے تو خوشی ہوئی ہے۔ کیوں رانا صاحب؟“ اور اس نے کوئی بٹن دبا کر دیوار بند کر دی۔

اور انکم ٹیکس کمشنر یوں کھل کر مسکرایا جیسے سیٹھ کے اشارے کا منتظر تھا۔

سیٹھ بولا۔ ”حاتم نے آپ کو بتایا ہو گا کہ میرے روزنامے کو آپ کی ضرورت ہے۔“

عباس نے حاتم کی طرف دیکھا اور پھر بولا تو مسلسل بولتا چلا گیا۔ ”آپ کے اخبار کو میری ضرورت ہے اور مجھے ایک اخبار کی ضرورت ہے۔ مشکل صرف یہ ہے کہ میں ممکن حد تک اصولی آدمی ہوں۔ ممکن حد تک اس لیے کہ ہمارا معاشرہ اتنا گندہ ہو چکا ہے کہ بعض چھوٹی چھوٹی بے اصولیاں ہماری زندگی کا معمول بن چکی ہیں اور انسان کا جی نہ بھی چاہے تو اسے اس طرح کی بے اصولی سے سمجھوتا کرنا پڑتا ہے۔ مگر بڑے بڑے مسئلوں پر نہ میں بے اصولی کا ارتکاب کر سکتا ہوں‘

نہ سمجھوتا کر سکتا ہوں۔ آپ ماشاء اللہ اس ملک کے کروڑ پتی بلکہ ارب پتی ہیں۔ آپ ملک کے سب سے بڑے ملوں کے سلسلے کے مالک ہیں۔ ملوں میں ہڑتالیں تو ہوتی ہی رہتی ہیں۔ اگر آپ کی کسی مل میں ہڑتال ہوئی تو میں تو ایک دیانت دار اور بااصول ایڈیٹر کی حیثیت سے ہڑتالیوں کے حق میں لکھوں گا کیونکہ مزدور لوگ محض تفننِ طبع کے لیے تو ہڑتالیں نہیں کرتے۔ وہ تو جب چار طرف سے مجبور ہو جاتے ہیں تو ہڑتال کرتے ہیں۔ اس صورت میں ان کے حق میں لکھنا ہر ایماندار ایڈیٹر کا فرض ہوتا ہے۔ اب اگر آپ کے اخبار میں آپ کی کسی مل کے ہڑتالیوں کے حق میں اداریہ آ گیا تو یقیناً“ آپ کے لیے یہ صورت ناقابلِ برداشت ہو گی اور مزدوروں کے حق میں نہ لکھنا میرے لیے ناقابلِ برداشت ہو گا‘ اس لیے میرے لیے آپ کے اخبار کی ادارت سنبھالنا مشکل ہے۔ میں حاتم سے یہ ساری باتیں کر چکا ہوں مگر وہ مجھے مجبور کر کے آپ کے پاس لے آیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ میری معذرت قبول کریں گے۔“

اس تمام دوران میں سیٹھ یوں مسکراتا رہا جیسے یہ سب کچھ اسے پہلے سے معلوم ہے۔ پھر بولا۔ ”شاید آپ نے میری ملیں نہیں دیکھیں۔ سب ملیں ایک سی نہیں ہوتیں۔ میں نے مزدوروں کی رہائش کے‘ علاج کے‘ ان کے بچوں کی تعلیم کے‘ ہر سال ان کے بونس کے ایسے انتظامات کر رکھے ہیں اور ان کی اتنی معقول اجرتیں مقرر کر رکھی ہیں کہ ان کے ہڑتال کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر جب ہماری ملوں میں کبھی ہڑتال ہو گی ہی نہیں تو آپ کو مجھ سے یا مجھے آپ سے کیا

اختلاف پیدا ہو سکتا ہے۔ کسی دوسری مل میں ہڑتال ہو اور آپ مزدوروں کے حق میں لکھیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ میری صنعت کار برادری احتجاج کرے گی تو میں انھیں سمجھا دوں گا کہ آزادیٔ رائے میرا پختہ اصول ہے سو میں اپنے اخبار کے ایڈیٹر پر کوئی پابندی کیسے عاید کر سکتا ہوں۔ سمجھے آپ؟ یہ مسئلہ تو یوں طے ہوا۔ اب مطلب کی بات بھی طے کر لینی چاہیے۔ مجھے معلوم ہے کہ جس اخبار کی ادارت آپ نے چھوڑی ہے وہاں سے آپ کو سات ہزار روپے تنخواہ ملتی تھی۔ میں اکیس ہزار روپے ماہانہ نذر کروں گا۔ آپ کو ایک بنگلہ بھی ملے گا۔ پانی، بجلی، گیس کا بل بھی اخبار ادا کرے گا۔ ایک آرام دہ کار بھی ہو گی جسے آپ جس طرح چاہیں استعمال کر سکیں گے اور پٹرول اور مرمت وغیرہ کا خرچ اخبار ہی برداشت کرے گا۔ تنخواہ کے علاوہ آپ کو میڈیکل الاؤنس وغیرہ کے نو ہزار روپے ملیں گے۔ یوں ٹوٹل تیس ہزار ماہانہ بیٹھتا ہے۔ یہ اتنے بڑے افسر آپ کے سامنے بیٹھے ہیں۔ ان کی تنخواہ اس رقم سے نصف سے بھی کم ہو گی۔ کیوں فروغ صاحب؟"

انکم ٹیکس کمشنر نے نہایت نیاز مندی سے "جی ہاں" کے الفاظ ادا کیے۔

سیٹھ پھر بولا۔ "عباس صاحب۔ اگر آپ کسی مد میں اضافہ چاہیں تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔ میرے اخبار کو آپ اور صرف آپ ایک معیاری اخبار بنا سکتے ہیں۔ اب بتائیے۔ کیا فیصلہ ہے آپ کا؟"

تیس ہزار روپے ماہانہ! ——— نصف جس کے پندرہ ہزار

ماہانہ ہوتے ہیں اور پھر مفت بنگلہ، مفت کی کار ——— عباس احمد کرسی پر بیٹھا نہ ہوتا تو اپنا توازن قائم رکھنے کے لیے کرسی پر بیٹھ جاتا۔ اس کے دماغ میں آندھی سی چلنے لگی۔ کچھ دیر تک کمرے میں مکمل خاموشی رہی۔ پھر حاتم کی آواز آئی۔ "کیا سوچ رہے ہو عباس؟ تمھارے اصول بھی محفوظ ہیں اور تمھیں اتنی بہت سی سہولتیں بھی پیش کی جا رہی ہیں۔ ملک کا یقیناً تم پر حق ہے مگر تمھارے بال بچوں کا بھی تو کچھ حق ہے۔ اس حق کو پورا کرنے کا اس سے بہتر موقع اور کیا ہو گا؟"

عباس احمد نے خاصی محنت کے بعد اپنا توازن سنبھالا اور سیٹھ کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "مجھے دو تین دن کی مہلت چاہیے تاکہ میں سوچ لوں اور کسی حتمی فیصلے پر پہنچ سکوں۔"

"ٹھیک ہے" سیٹھ بولا۔ "کیوں حاتم؟"

"بالکل ٹھیک ہے سر" حاتم بولا۔

سیٹھ نے عباس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "میرے اخبار کے دروازے آپ کے لیے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔ سمجھے آپ؟"

"جی" عباس بولا اور حاتم کے ساتھ باہر پورچ میں آ گیا۔

حاتم نے ڈرائیور کو اشارہ کیا۔ وہ لپک کر آیا مگر عباس نے کہا۔ "میں گھر تک پیدل جانا چاہتا ہوں۔ راستے میں بھی سوچتا جاؤں گا۔ آج میں نے روزانہ کی ٹہلائی بھی نہیں کی۔"

حاتم بولا۔ "جیسا تمھارا جی چاہے، مگر یار۔ جذبے کے علاوہ انسان میں عقل بھی ہوتی ہے۔ عقل سے کام لینا۔"

عباس مسکرایا اور بازو الوداعی انداز میں بلند کر کے بنگلے سے

باہر آگیا۔

"بھئی۔ بہت معقول پیش کش ہے۔" اس نے خود اپنی سرگوشی سنی اور اچانک اسے محسوس ہوا کہ وہ سکڑ کر کیڑا سا بن گیا ہے اور اپنے بل کی تلاش میں رینگتا جا رہا ہے۔

اس نے رک کر اپنا سر دائیں بائیں زور سے جھٹکا۔ دونوں ہتھیلیوں سے دونوں آنکھیں زور زور سے ملیں اور تیز تیز قدم اٹھا کر گھر کا رخ کیا۔

تیس ہزار روپے اور بنگلہ اور لمبی چوڑی "کار" اور ——— "سوچتے سوچتے وہ ایک دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ گیا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کی جون بدل گئی ہے اور وہ انسان سے چیونٹا بن چکا ہے۔ اس کے قدموں کے پاس کالے کالے چیونٹوں کی ایک قطار جا رہی تھی۔ وہ بھی ان میں شامل ہو گیا۔ مگر چند ہی قدموں کے بعد جب یہ چیونٹے ایک درخت کے تنے پر چڑھنے لگے اور اس نے درخت کی آخری پھننگ کو دیکھا کہ آسمان میں اتری جا رہی ہے تو کانپ گیا اور چکرا کر بیٹھ گیا۔ فٹ پاتھ سے گزرتے ہوئے دو آدمی اس کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

وہ اٹھا اور جب گھر پہنچا تو اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا اور ہاتھ کانپ رہے تھے۔ "کیا ہوا آپ کے دشمنوں کو؟" اس کی بیوی سلمٰی نے گھبرا کر پوچھا۔ مگر وہ سیدھا اندر کمرے میں چلا گیا اور پلنگ پر گر کر تکیہ چہرے پر رکھ لیا۔ "میں کچھ سوچ رہا ہوں" وہ بولا۔ "مجھے سوچنے دو۔"

"کیا سوچنے دوں؟" بیوی دروازے پر سے بولی جہاں تینوں بچے

خوفزدہ سے کھڑے تھے۔ "مجھے کیوں نہیں بتاتے آپ؟"

اور عباس تکیہ ایک طرف پٹخ کر اٹھ کھڑا ہوا اور بھیپھڑوں کی پوری قوت سے چیخا۔ "نہیں بتاتا۔ نہیں بتاتا۔ میری سوچوں پر کسی کا اجارہ نہیں ہے۔ جاؤ اپنا کام کرو ——— جاؤ!"

چھوٹا بچہ ڈر کر رونے لگا۔ سلمٰی سب کو سمیٹتی دروازے پر سے ہٹ گئی۔ عباس نے اپنے آپ کو پلنگ پر گرا دیا۔ پھر وہ چت لیٹ گیا۔ اس کی نظریں چھت کے ایک نقطے پر جم کر رہ گئیں۔ وہاں ایک چھپکلی کسی مکھی مچھر کی تاک لگائے بیٹھی تھی۔ پھر وہ بجلی کی سی تیزی سے اپنے شکار پر جھپٹی اور پوری چھت عبور کر کے دیوار پر آ گئی۔ عباس کی نظریں اس پر گڑی ہوئی تھیں۔ جب چھپکلی دیوار سے اتر کر فرش پر آئی تو عباس پلنگ پر اٹھ بیٹھا۔ چھپکلی ایک مقام پر پتھرائی بیٹھی رہی۔ عباس بھی بت بنا بیٹھا رہا۔ پھر وہ واپس دیوار کی طرف لپکی تو عباس بھی اٹھ کر دیوار تک یوں بے ارادہ آ گیا جیسے اس کی نکیل چھپکلی کے ہاتھ میں آ گئی ہو مگر چند پل چھپکلی کو گھورتے رہنے کے بعد وہ سر پکڑ کر فرش پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی آنکھیں رگڑ ڈالیں اور میز پر سے ایک پیپر ویٹ اٹھا کر پوری قوت سے چھپکلی کو نشانہ بنا کر مارا۔ چھپکلی چھت کے دوسرے کونے کی طرف لپک گئی اور پیپر ویٹ نے سنگار میز کے شیشے پر گر کر اسے کرچی کرچی کر ڈالا۔ اس کی بیوی حواس باختہ اندر آ گئی۔ اور پکاری "کیا ہوا؟ کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ یہ شیشہ کیوں توڑ دیا آپ نے؟"

اور عباس چھت کی طرف انگلی اٹھا کر بولا۔ "اس چھپکلی سے پوچھو۔"

"چھپکلی سے پوچھو!" بیوی نے حیرت سے یہ الفاظ دھرائے۔ پھر زار زار روتی ہوئی باہر بھاگی۔ "ھائے میں مرجاؤں' انھیں تو کچھ ہو گیا ہے۔"

"کیا ہو گیا ہے خدا نخواستہ؟" پڑوسن نے دیوار کے ادھر سے پوچھا۔

اور عباس احمد کمرے سے باہر آ گیا۔ "کچھ نہیں ہوا بہن صاحبہ۔ میرے ہاتھ سے پیپر ویٹ چھوٹ کر شیشے پر گر گیا اور یہ نیک بخت سمجھی مجھے کچھ ہو گیا ہے۔"

وہ واپس کمرے میں آکر کرسی پر بیٹھا تو سلمیٰ اندر آ گئی اور اس کے قریب آ کر بڑے پیار سے بولی۔ "آپ کو میری قسم' مجھے سچ سچ بتایئے آپ کو کیا ہوا ہے۔"

"سچ مچ بتاؤں؟" عباس نے بڑے سکون سے پوچھا۔

"جی ہاں۔ سچ مچ بتایئے" سلمیٰ بولی۔

"اچھا تو سچی بات یہ ہے کہ میں ایک لمحے کے لیے انسان سے چھپکلی بن گیا تھا۔ اس سے پہلے ایک کیڑا بنا تھا۔ پھر مکوڑا بنا تھا۔ میں وہ نہیں رہا جو میں ہوں۔ اور اسکا سبب یہ ہے کہ ـــــ"

سلمیٰ حواس باختہ کھڑی ہوگئی اور گلوگیر آواز میں بولی۔ "اگر آپ مذاق کر رہے ہیں تو ٹھیک ہے مگر آپ تو مسکراتے ہی نہیں۔ آپ کو میری قسم بتایئے۔ کیا ہوا ہے آپ کو؟" پھر وہ عباس کے پاس بیٹھ گئی اور اس کے دونوں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر رونے لگی۔ "خدا کے لیے مجھے کچھ تو بتایئے۔"

عباس نے اپنے ہاتھ چھڑا کر سلمیٰ کو اپنے پہلو سے لگا لیا۔ "بات یہ ہے سلمیٰ کہ ابھی کچھ دیر پہلے مجھے حاتم ایک اخبار کے مالک کے پاس لے گیا تھا۔"

"وہ تو مجھے معلوم ہے۔" سلمیٰ بولی۔

"اس اخبار کا مالک ملک کا بہت بڑا سیٹھ ہے۔ وہ ارب پتی ہے۔ پتہ ہے ایک ارب کتنے کا ہوتا ہے؟ ایک سو کروڑ کا ایک ارب بنتا ہے اور ایک سو لاکھ کا ایک کروڑ بنتا ہے۔ حساب لگا لو کہ یہ کیا چیز ہے۔ اس نے مجھے اپنے اخبار "عدل" کی ایڈیٹری کے لیے پتہ ہے کتنی تنخواہ کی پیش کش کی ہے؟ بتاؤں؟ سنو گی تو بے ہوش نہ ہو جانا۔" وہ ہنسا۔

اس دوران میں عباس پہلی بار ہنسا تھا اس لیے سلمیٰ کے چہرے پر اطمینان کی چمک آ گئی۔ وہ بولی۔ "جو بیوی اپنے میاں کی بیکاری کے دنوں کو بھی ہنسی خوشی برداشت کر سکتی ہے وہ سب کچھ برداشت کر سکتی ہے۔"

عباس نے سلمیٰ کو ایک بار پھر اپنے پہلو میں سمیٹا۔ "سیٹھ نے مجھے تیس ہزار روپے ماہانہ اور مفت کے بنگلے اور مفت کی کار کی پیش کش کی ہے۔"

"ہائے میں مرجاؤں!" یہ کہہ کر سلمیٰ جیسے سُن ہو کر رہ گئی۔ وقفے کے بعد بولی۔ "بڑا سیانا معلوم ہوتا ہے۔ اس نے تو آپ کی ٹھیک ٹھاک قیمت لگائی ہے۔"

"قیمت لگائی ہے؟" عباس نے سلمیٰ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "یعنی تم کہتی ہو کہ سیٹھ مجھے خرید رہا ہے؟"

"نوکری اور کیا ہوتی ہے" بیوی نے کہا۔ "ایک شخص کسی دوسرے شخص کو ملازم رکھتا ہے تو دراصل اس کی قابلیت اس کی ذہانت خریدتا ہے۔"

"یہ بات تو ہے" عباس نے سلمیٰ سے اتفاق کیا۔ "مگر ہر انسان کی ایک انا ہوتی ہے۔ اگر یہ انا بھی بِک جائے تو وہ رہ کیا جائے گا۔ صرف ایک سانس لیتا ڈھانچا۔ اور میں اپنی انا نہیں بیچنا چاہتا۔"

"تو پھر آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟"

"تمھارا کیا خیال ہے تیس ہزار ماہانہ آمدنی کے بارے میں،جو ایک سال میں ساڑھے تین لاکھ سے بھی زیادہ ہوگی۔ پھر بنگلہ، پھر کار، پھر بنک بیلنس۔ ایک دم ہم کتنے اونچے ہو جائیں گے!"

"اونچے تو ہو جائیں گے۔" سلمیٰ جیسے مسئلے کو کھنگال رہی تھی۔ "وہ تو ہے۔ اونچے تو ہو جائیں گے۔"

"اونچا ہونا تو بری بات نہیں ہے نا سلمیٰ "عباس بھی بلند آواز سے سوچ رہا تھا۔ "سبھی کا حق ہے کہ وہ بہتر سے زیادہ بہتر کی طرف بڑھتا رہے۔"

"کیوں نہیں ۔ سبھی کا حق ہے۔"

"تو پھر میں کیا کروں" عباس نے سوچ بچار جاری رکھی۔ "اُدھر میرے اصول ہیں۔ اُدھر ایک سہ ماہی میں ایک لاکھ کی یافت ہے۔ ایسا لگتا ہے میں اپنے اصولوں کو گھورے پر پھینکنے جا رہا ہوں۔"

"اس لیے کہ اخبار کا مالک ارب پتی ہے اور کئی ملوں کا مالک ہے؟"

"ہاں"

"اس سے پہلے آپ جن اخباروں میں کام کرتے رہے ہیں وہ کون سے غریب غربا کے اخبار تھے۔ وہ بھی تو سرمایہ داروں اور جاگیرداروں اور پھر صنعت کاروں کے اخبار تھے۔"

"مگر دیکھ لو۔ جہاں بھی میری دیانت کو خطرہ پیش آنے لگا میں ملازمت چھوڑ کر گھر میں آ بیٹھا۔"

"تو اس بار آپ کو کس نے روکا ہے۔ اب کے بھی اصولوں کو خطرے کا سامنا ہوا تو گھر چلے آیئے گا۔"

عباس نے سلمیٰ کو دونوں کاندھوں سے پکڑ کر پیار سے اس کے چہرے کو دیکھا پھر مسکرا کر بولا۔ "یہ اتنی بہت سی دانائیاں تم نے کہاں سے سمیٹ لی ہیں سلمیٰ عباس احمد صاحبہ؟"

پھر دونوں بے اختیار ہنسنے لگے۔ بچے بھی بھاگے آئے اور ان کی ہنسی میں شامل ہو گئے۔

دوسرے دن صبح ناشتے کے بعد عباس نے سیٹھ کے بنگلے کا رخ کیا۔ وہ بڑی آسودگی کے ساتھ نپے تلے قدم اٹھاتا چل رہا تھا۔ کوٹھی کے پورچ میں بھی وہ اتنے اعتماد سے داخل ہوا جیسے سیٹھ نے آدھی کوٹھی اس کی ملکیت میں دے دی ہے۔ اس نے سیٹھ کو اپنے آنے کی اطلاع بھجوائی تو اسے فوراً بلا لیا گیا۔ سیٹھ نے اپنے کمرے میں عباس سے نہایت گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "تشریف رکھیے۔ حاتم ساتھ نہیں آیا آپ کے؟"

عباس صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "میں نے سوچا ایک مختصر سی

بات ہی تو کرنی ہے۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ـــــــ"

اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ سیٹھ فون کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ چونگا اٹھایا اور پھر ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ "کیا؟" وہ اس زور سے کڑکا کہ عباس بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ "ہڑتال اور ہماری مل میں؟" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ "نہ کوئی پیشگی نوٹس' نہ بات چیت کی کوئی کوشش۔ یہ کیا غنڈہ پن ہے؟ میں اپنی مل کی یہ ہتک برداشت نہیں کر سکتا۔ مل کی تالہ بندی کر دو۔ ورکرز سے سب سہولتیں ایک دم واپس لے لو۔ اپنی فورس کو کام میں لاؤ۔ پولیس کے پہنچنے سے پہلے ہی انھیں سیدھا کر دو۔ مجھے پانچ منٹ کے اندر اطلاع دو کہ میرے آرڈرز پر عمل ہوا یا نہیں۔ باسٹرڈز۔" اور اس نے چونگا فون پر تڑاخ سے دے مارا۔

پھر وہ مسکرانے کی کوشش کرتا ہوا عباس کی طرف بڑھا اور صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "جی۔ آپ کچھ کہنے لگے تھے۔"

"میں کچھ عرض کرنے حاضر ہوا تھا۔" عباس بولا۔ "میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں آپ کے اخبار کی ایڈیٹری کی پیش کش قبول نہیں کر سکوں گا۔"

"تو پھر آپ یہاں کس خوشی میں آئے ہیں؟" سیٹھ صوفے پر سے اٹھتے ہوئے' فون پر کڑکنے کے بعد دوسری بار کڑکا۔

اور عباس احمد کوئی جواب دیے بغیر اٹھا اور مسکراتا ہوا سڑک پر آ گیا۔

✱

عاجز بندہ

بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گھر سے مسجد اور مسجد سے گھر کے سفر کے سوا میاں حنیف کا کوئی کام نہ تھا۔ اس کا گھر صرف ایک کوٹھے پر مشتمل تھا۔ یہ خاصا لمبا کوٹھا تھا۔ وسط میں ایک دروازہ تھا اور چھت میں ایک گول سوراخ تھا جسے میاں حنیف برسات کے دنوں میں پختہ مٹی کے سر پوش سے ڈھانپ دیتا تھا' ورنہ دروازہ بند ہونے کے بعد چھت کا صرف یہ سوراخ ہی باہر کی دنیا سے میاں حنیف کے رابطے کا واحد ذریعہ تھا۔ علاقے کی زبان میں چھت کے اس سوراخ کو گھ کہتے تھے۔ دن کو تو کوٹھا اس گھ میں سے آتی ہوئی روشنی سے چمک اٹھتا تھا۔ البتہ رات کو وہ میاں حنیف کے صرف یہ کام آنے لگا تھا کہ چارپائی پر لیٹے لیٹے اسے کبھی کبھار گھ میں سے ایک آدھ ستارہ نظر آ جاتا اور میاں حنیف کا باطن جگمگا اٹھتا۔ تب میاں حنیف کو محسوس ہوتا کہ وہ بظاہر تنہا ہونے کے باوجود تنہا نہیں ہے۔ یہ ستارہ راتوں کے تاریک سناٹوں میں اس کے دوست کا کردار ادا کرتا تھا۔ ساون بھادوں کے بادلوں سے میاں حنیف کو اسی لیے چڑ سی تھی کہ اسے بارش کے ڈر سے گھ کو ڈھانپ دینا پڑتا تھا۔ نہ بھی ڈھانپتا تو گھنگھور گھٹائیں ستاروں کو کھا جاتی ہیں۔ کئی راتوں کو جب آسمان صاف ہوتا تھا تو گھ میں سے کوئی ستارہ نظر نہ آنے سے

وہ بے چین ہو جاتا تھا۔ وہ چارپائی کا زاویہ مزید بدلتا اور ایک بار پھر اس پر لیٹ جاتا۔ بڑی جدوجہد کے بعد اسے کوئی چنگاری سا ستارہ بھی نظر آتا تو مسکراہٹ سے اس کا چہرہ کھل اٹھتا اور وہ ستارے کو یوں پیار سے دیکھتا جیسے اپنے مولا سے اس کی ملاقات ہو گئی ہے اور جیسے کہہ رہا ہے کہ یار، تم کہاں چھپ جاتے ہو۔ یہ دوستی تو نہ ہوئی ناں کہ میں تمھاری جدائی میں سارا آسمان گھوم آؤں اور تم کہیں نظر ہی نہ آؤ۔ اب نظر آئے ہو تو نظر آتے رہنا ورنہ مجھے نیند نہیں آئے گی۔ اور مجھے نیند نہ آئی تو میں تمھیں دیکھ دیکھ کر تھکا دوں گا۔

کوٹھے کے وسط میں دیوار سے لگی ہوئی ایک سکار تھی جس میں وہ غلہ رکھا رہتا تھا جو اس کی دو چار بیگھہ زمین پر کام کرنے والا مزارع اسے باقاعدگی سے پہنچاتا تھا۔ سکار پر میاں حنیف کی چھوٹی موٹی ضروریات جمع رہتی تھیں۔ اس پر ایک صراحی اور ایک منگرا بھی رکھا رہتا اور پرلی طرف دیوار میں گڑے ہوئے لکڑی کے چپٹے ٹکڑے پر مٹی کا چراغ جلتا رہتا جس کی روئی کی وٹ تیل میں ڈوبی رہتی۔ میاں حنیف عشاء کی نماز کے بعد واپس کوٹھے میں آ کر چراغ روشن کرتا۔ پھر دروازہ بند کر دیتا اور چارپائی پر بیٹھ کر اونچے سریلے سروں میں قرآن مجید کے آخری سیپارے کی آخری دس پندرہ سورتیں تلاوت کرتا رہتا اور جھومتا رہتا۔ نماز کے علاوہ صرف یہ سورتیں اسے ازبر تھیں چنانچہ انھی کو بار بار دہراتا۔ پھر وہ لکڑی کے ستون میں گڑی ہوئی میخ پر سے تسبیح اتارتا اور کلمہ کا ورد کرنے لگتا۔ جب تھک جاتا تو دیا بجھا کر چارپائی پر لیٹ جاتا اور گھ میں سے کوئی ستارہ ڈھونڈنے لگتا۔ اور ستارہ مل جاتا تو

جیسے اسے خدا مل جاتا۔

میاں حنیف نے نو عمری میں سات آٹھ جماعتوں تک مدرسے میں تعلیم بھی پائی تھی۔ اور قرآن شریف بھی ناظرہ ختم کر رکھا تھا۔ پھر جوانی میں اس کی شادی بھی ہوئی تھی مگر ایک سال کے اندر اندر وہ رنڈوا ہو گیا تھا۔ بچے کو جنم دینے کے دوران اس کی بیوی مر گئی اور بچہ بھی مردہ پیدا ہوا۔ تب میاں حنیف کا دل دنیا سے اچاٹ ہو گیا اور اس نے صرف اپنے مولا سے لو لگائے رکھنے کا وہ سلسلہ شروع کیا جو اب تک جاری تھا۔ اس کے ایک دو عزیزوں نے اسے علاقے کے ایک مشہور پیر کے پاس لے جانا چاہا تھا کہ وہ ان کی بیعت کر کے اپنے آپ کو سنبھال سکے مگر میاں حنیف ہر بار انھیں یہ کہہ کر ٹال دیتا کہ میرا بڑا پیر تو، میں اس پر قربان جاؤں، میرا رسولؐ ہے اور وہی مجھے میرے مولا تک پہنچائے گا۔ یہ پیر لوگ تو خود میرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دستگیری کے محتاج ہیں۔

ایک بار پوہ کے مہینے میں جب جھڑی لگی تو کئی روز تک لگ رہی۔ مسلسل برستی ہوئی سوئی کی نوک کی سی بوندیں کچی چھتوں میں اترتی چلی گئیں۔ میاں حنیف کے کوٹھے کے ایک حصے کی چھت بھی ٹپکنے لگی تو وہ ہر ٹپکے کے نیچے مختلف برتن رکھتا رہا کہ کچے فرش کے چہرے پر چیچک کے سے داغ نہ پڑ جائیں۔ پیتل کے ایک کٹورے میں جب چھت سے قطرے ایک تواتر کے ساتھ گرنے لگے تو میاں حنیف کو ایسا لگا جیسے کوئی ساز بج رہا ہے۔ وہ اس عجیب و غریب اتفاق پر مسکرایا کہ ہر برتن میں ٹپکنے والے قطروں کی آواز مختلف تھی اور یہ سب آوازیں مل کر

جلترنگ سا بجانے لگی تھیں۔

پھر جب وہ چارپائی پر بیٹھ کر کلمہ طیبہ کا ورد کرنے لگا تو ایک اور احساس نے بھی اسے مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ وہ یہ سوچ کر مسکرایا کہ اس کا مولا اس پر کتنا مہربان ہے کہ بارشوں میں کچی چھتیں ٹپکتی تو ہیں اور اسی لیے اس کے کوٹھے کی چھت بھی ٹپک رہی تھی مگر آدھی ٹپک رہی تھی اور وہ آدھی چھت جس کے نیچے میاں حنیف کی چارپائی بچھی تھی' بالکل محفوظ تھی۔ ایک ذرا سا قطرہ بھی تو اس میں سے نہیں ٹپکا تھا۔ "میرا مولا تو اپنی مخلوق کی نیتیں تک پڑھ لیتا ہے۔" وہ سوچتا رہا۔ "پھر کیا وہ اپنے اس عاجز بندے کو نہیں دیکھتا ہو گا جو گھر سے مسجد اور مسجد سے گھر کے سفر میں صرف اور صرف اپنے مولا کے نام کا ورد کرتا ہے۔ اس نے حکم دیا ہو گا کہ میرے اس عاجز بندے کی چھت کا وہ حصہ محفوظ رہے جس کے نیچے وہ صبح کی اذان تک سوتا ہے۔"

یہی سوچتے سوچتے وہ سو گیا مگر پھر ایک خوفناک آواز نے سے ہڑبڑا کر اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ وہ سمجھا قیامت آ گئی ہے۔ وہ کلمہ طیبہ کا ورد کرنے لگا۔ پھر اس نے بجلی کا لشکارا دیکھا۔ کوٹھے کے اندر بجلی کا یہ لشکارا کیسے پہنچا! وہ چارپائی پر سے اٹھ کر سکار پر رکھے چراغ کو ڈھونڈنے لگا تو وسطی ستون کی پرلی طرف نکل گیا اور تیز پھوار میں بھیگ گیا۔ یہ کوٹھے کے اندر پھوار کیسے آ گھسی! ایک بار پھر بجلی چمکی تو اس نے دیکھا کہ وہ اپنے کوٹھے کی گری ہوئی آدھی چھت کے ڈھیر کے پاس کھڑا تھا۔

"واہ رے میرے مولا" وہ بڑبڑایا۔ "تو نے اپنے اس عاجز بندے کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا نا جو تو دوسروں کے ساتھ کرتا ہے۔ میرے

کوٹھے کی آدھی چھت گرانے کے بعد بجلی چمکاتا ہے کہ دیکھ لے اپنے آدھے گھر کا ملبہ۔ واہ رے میرے مولا!"

پھر یکایک وہ خوفزدہ سا ہو کر ہٹا اور چارپائی پر جا بیٹھا۔ سردی کی بجائے وہ خوف سے کانپ رہا تھا۔ "میں یہ کیا بک دیا میرے مولا۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "تیری بارش نے چھت کے اس حصے کو تو ذرا سا بھی نہیں چھیڑا نا جس کے نیچے تیرا یہ عاجز بندہ سو رہا تھا۔ تو نے دنیا کو یہ تماشا دکھا دیا کہ ضروری نہیں پوری کی پوری چھت بیٹھ جائے۔ آخر اپنے مولا کے عاجز بندے بھی تو ہوتے ہیں۔ ان کی حفاظت بھی تو ضروری ہے۔ اور تو نے اپنے اس عاجز بندے کو محفوظ رکھا۔ تیری حکمتیں کب کسی کی سمجھ میں آئی ہیں میرے مولا!"

تب اس نے بہت دور سے آتی ہوئی صبح کی اذان سنی۔ مسجد کچھ زیادہ دور نہیں تھی مگر مسلسل برستی ہوئی بارش نے موذن کی آواز کو لپیٹ لیا تھا۔ اذان ختم ہوئی تو میاں حنیف نے کلمہ طیبہ پڑھا۔ ایک کھیس لپیٹا۔ ایک ٹوکری سر پر رکھی کہ بھیگنے سے ذرا سا تو بچ سکے۔ کوٹھے کے دروازے سے نکل کر کواڑ بھیڑے اور تالہ ہاتھ میں لے کر اس نے کچھ سوچ کر تالا لگا دیا۔ پانی بھری گلیوں میں شپشپاتا ہوا گزرا۔ مسجد میں پہنچ کر ٹوکری ایک طرف رکھی۔ بھیگے ہوئے کھیس کو مسجد کے اندر ایک کیل سے ٹکا کر وضو کیا اور نماز میں شامل ہو گیا۔

نماز کے بعد امام صاحب نے دعا مانگی۔ "یا الہ العالمین۔ اب تو اس بارانِ رحمت کو روک لے کہ تو نے ہی ہر چیز کی افراط سے بچنے کی تلقین فرما رکھی ہے۔ ہم غریب لوگ ہیں۔ ہمارے گھر کچے ہیں۔ جھڑی

انھیں چاٹے لے رہی ہے۔ یا الہ العالمین اب یہ جھڑی رک جائے۔"
تب میاں حنیف کی سب سے بلند آواز مسجد میں گونجی۔ "آمین——"

امام صاحب اور نمازیوں نے حیران ہو کر میاں حنیف کو دیکھا اور دعا دہرادی ".......... جھڑی رک جائے۔"

"آمین" میاں حنیف گرجا۔

"جھڑی رک جائے"

"آمین" میاں حنیف کڑکا۔

سب لوگ میاں حنیف کو دیکھ رہے تھے کہ اس کم گو خاموش نمازی کو آج کیا ہوگیا ہے کہ اس کی "آمین" مسجد کی چھت سے بھی پار نکلی جا رہی ہے۔

دعا کے بعد امام صاحب نے میاں حنیف سے کہا بھی کہ دعائیہ جملوں کے بعد آمین کہنا تو جائز ہے مگر اتنی بلند آواز سے آمین کہنے کی کیا ضرورت تھی۔

اور میاں حنیف بولا۔ "مولوی جی۔ یہ میرے مولا اور اس کے ایک عاجز بندے کا معاملہ ہے۔"

سب لوگ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

میاں حنیف نے بھیگا ہوا کھیس لپیٹ کر سر پر ٹوکری رکھی اور مسجد سے باہر آگیا۔ یہ سورج نکلنے کا وقت تھا مگر رات سی چھا رہی تھی۔ گھٹائیں جھکی ہوئی تھی جیسے کچھ اور جھکی تو زمین پر گر پڑے گی۔ مسلسل گرج کی بھی آواز آرہی تھی مگریوں دبی دبی سی جیسے گھٹا اندر ہی اندر گونج رہی ہے۔ میاں حنیف ندیوں کی طرح بھری گلیوں میں سے گزر کر

جب اپنے کوٹھے تک پہنچا تو بارش ٹوٹ کر برسنے لگی۔ اس نے تالا کھولا اور زنجیر کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ ایک خوفناک دھماکا ہوا اور میاں حنیف ڈر کر چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ صورتِ حال کو سمجھ گیا ہے۔ اس کے کوٹھے کی باقی آدھی چھت بھی گر گئی تھی۔ "واہ!" اس نے آہستہ سے کہا۔ "تیری کتنی بے پروا ذات ہے میرے مولا۔" تالا کھول کر دروازہ کھولنا چاہا تو اس نے کھلنے سے انکار کر دیا۔ چھت کے ملبے کے دباؤ نے کواڑ بھینچ رکھے تھے۔ میاں حنیف بے قرار ہو گیا۔ وہ گری ہوئی چھت اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا۔ دھماکے کی آواز سن کر آس پاس کے لوگ جمع ہو گئے۔ سب نے زور لگا کر کواڑوں کو ذرا سا کھول لیا۔ تب میاں حنیف نے ادھ کھلے کواڑوں میں سے اندر جھانکا۔ پھر مسکراتا ہوا پلٹا اور بولا۔ "کیا کہنے ہیں میرے مولا تیری بے نیازیوں کے۔ تیرا یہ عاجز بندہ تیری بے پروائیوں کا کیا حساب رکھے۔ تیری یہی مرضی ہے تو یہی سہی۔" لوگ واپس جانے لگے تھے۔ اس نے بھی تالا ایک طرف پھینک کر ہاتھ جھاڑے اور وہاں سے چل پڑا۔

جب میاں حنیف مسجد کے قریب پہنچا تو بجلی ہزار بجلیوں کی طرح چمکی اور بادل اس زور سے کڑکا کہ فضا دیر تک لرزتی رہی۔ میاں حنیف نے رک کر آسمان کی طرف دیکھا اور بولا۔ "کیا تجھے بہت غصہ آ رہا ہے اپنے اس عاجز بندے پر میرے مولا! اس کا تو ایک ہی کوٹھا تھا۔ اس کی چھت تو تیری بارشوں نے برابر کر دی۔ اب تیرا بادل کیوں دھاڑ رہا ہے؟ مجھ پر بجلی گرانا باقی ہے تو وہ بھی گرا دے۔ اے بادل! چل

دھاڑ ——— دھاڑ۔" اور وہ دیر تک آسمان کی طرف غصے سے دیکھتا رہا

———

وہ مسجد میں داخل ہوا تو سر سے پاؤں تک بری طرح بھیگ رہا تھا اور ٹھنڈ سے کپکپا رہا تھا۔ پھر جب وہ محراب کے پاس دیوار کا سہارا لے کر بیٹھا تو بیٹھتے ہی رونے لگا۔ "یہ سب کچھ تو میں نے غصے میں بک دیا تھا میرے مولا' اور غصہ تو حرام ہوتا ہے۔ مجھے معاف کر دے میرے مولا کریم۔ اپنے اس عاجز بندے کو معاف کر دے میرے مولا۔"

آس پاس سے چند لوگ آئے اور میاں حنیف کو دلاسا دیتے رہے۔ بارش سارا دن برستی رہی۔ وقفے وقفے سے کچی دیواریں گرنے کی آواز آتی تو میاں حنیف چونکتا۔ پھر اس کی آنکھیں بھیگ جاتیں۔ "تیری ذات کتنی بے پروا ہے میرے مولا۔ جو کچے مکان ہیں وہ گر رہے ہیں۔ جو پکے مکان ہیں وہ تنے کھڑے ہیں۔ تیری حکمتوں کا حساب کون کرے میرے مولا۔"

مغرب کی نماز کے بعد سب لوگ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ آسمان ایک دم اتنا صاف ہو گیا جیسے یہاں سے کبھی کوئی بادل گزرا بھی نہیں۔ چاند یوں چمک رہا تھا جیسے وہ سورج ہے اور ستارے جیسے آسمان سے نیچے لٹکے پڑ رہے تھے۔ امام صاحب اور دوسرے نمازی میاں حنیف کو مسجد کے ایک حجرے میں لے آئے۔ ایک نمازی نے میاں حنیف کے لیے بستر بغل میں دبا رکھا تھا۔ پھر امام صاحب نے کہا۔ "تو اللہ لوک ہے میاں حنیف۔ تُو پروردگار کا نیک اور عاجز بندہ ہے۔ مسجد کے حجرے میں رہنے کا تیرا حق بنتا ہے۔ اب تُو یہیں رہا کرا۔"

اور میاں حنیف بولا۔ "ٹھیک ہے مولوی جی۔ میرے گھر کی چھت گر گئی ہے تو میرے مولا کا گھر تو موجود ہے۔ میرا مولا مجھے پناہ نہیں دے گا تو اور کون دے گا۔"

عشاء کی نماز کے بعد جب مسجد خالی ہو گئی تو وہ حجرے میں آیا۔ فرش پر بستر بچھایا اور اس پر بیٹھ کر آخری سیپارے کی آخری دس پندرہ سورتوں کا ورد کرتا رہا۔ تسبیح پاس نہیں تھی اس لیے انگلیوں کی پوروں پر درود شریف کی گنتی کرتا رہا۔ جب تھک گیا تو بستر پر لیٹ گیا۔ پھر ایک دم جیسے بھڑک کر اٹھا۔ اندھیرے میں حجرے میں گھومتے ہوئے پوری چھت کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر جیسے مایوس ہو کر اس نے حجرے کا دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔ اسے معلوم تھا کہ مسجد کے احاطے کے ایک گوشے میں مسجد کا ایک خادم رہتا ہے۔ میاں حنیف نے اس کے دروازے پر دستک دی تو اس نے اندر سے زنجیر کھولی اور پوچھا۔ "کون ہے بھائی؟"

"میں ہوں" میاں حنیف بولا۔ "حنیف۔ اپنے مولا کا عاجز بندہ۔"

خادم نے باہر آ کر تشویش سے حنیف کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "کیا ہوا میاں جی؟ آپ تو حجرے میں تھے۔"

"ہاں بھائی۔" میاں حنیف نے کہا۔ "حجرے میں تو ہوں پر تجھ سے یہ پوچھنے آیا ہوں کہ کیا اس حجرے کی چھت میں کوئی گھ نہیں ہے؟"

"ہے۔ کیوں نہیں ہے" خادم بولا۔ "بارش کی وجہ سے

ڈھانپ رکھا ہے۔"

"بارش تو رک گئی ہے میرے بھائی۔" میاں حنیف نے کہا۔ "گھ پر سے ڈھکنا ہٹ جانا چاہیے۔"

"ہٹ جائے گا میاں جی۔" خادم بولا۔ "صبح سویرے پہلا کام یہی کروں گا۔"

"نہیں بھائی۔" میاں حنیف نے اصرار کیا۔ "ابھی اوپر جا کر ہٹا دے ڈھکنا۔ مجھے اپنے مولا سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

خادم کچھ نہ بولا۔ وہ میاں حنیف کی بات سن کر خوف زدہ سا ہو گیا تھا۔ فوراً اوپر لپکا اور واپس آ کر بولا۔ "ہٹا دیا ڈھکنا میاں جی۔"

"میرا مولا تجھے خوش رکھے۔" میاں حنیف نے دعا دی اور حجرے میں آ کر اور بستر پر لیٹ کر چھت کو گھورنے لگے۔

پھر اسے گھ میں سے ایک چھوڑ اکٹھے چار ستارے نظر آ گئے اور خوشی کے مارے وہ باآواز ہنسنے لگا۔ "ایک دم چار ستارے! میرا مولا مجھے بہلا رہا ہے۔ پر میرے مولا۔ میں تجھ سے روٹھا ہی کب تھا۔ تیرا یہ کرم کیا کم ہے کہ میرے کوٹھے کی چھت کا باقی حصہ اس وقت گرا جب میں اس چھت کے نیچے موجود نہیں تھا۔ مجھے تو تجھ سے کوئی شکایت نہیں میرے مولا۔ پھر تو نے اکٹھا چار ستارے کیوں بھیج دیے مجھے منانے کو۔ میں تیرا عاجز بندہ تو عمر بھر تیرے ایک ہی ستارے سے بہلا رہا ہوں۔"

✳

چرواہا

میں نے بکریاں چراتے چراتے آدھی صدی گزار دی ہے۔ میں نے کبھی چھٹی نہیں کی۔ عید کی نماز پڑھ کر بھی ریوڑ کو ہانکا ہے اور جنگل کی طرف نکل گیا ہوں۔ میں سوچتا ہوں گاؤں بھر میں بکریوں کے مالک صرف اس لیے صبح سویرے اپنی بکریاں میرے باڑے میں چھوڑ جاتے ہیں کہ یہ دن بھر چریں گی تو شام کو دودھ سے بھرے ہوئے تھن لے کر واپس آئیں گی۔ بکریوں کو ہر روز چرنے لے جانے کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ میں اپنی نوری بیٹی کو شان سے رخصت کرنے کے لیے جہیز کی رقم جمع کر رہا ہوں۔ ویسے تو میں بہت سادہ سا آدمی ہوں اور میں تو اپنی بیٹی کو سادگی ہی سے رخصت کر دیتا اگر بیگے نے مجھے طعنہ نہ دیا ہوتا۔ اس نے کہا تھا کہ تمھارا ریوڑ میرے ریوڑ سے بڑا سہی پر جس شان سے میں نے اپنی بیٹی کو رخصت کیا ہے' اسی شان سے تم اپنی بیٹی کو رخصت کرنے کی کوشش کرو گے تو خون تھوکنے لگو گے۔ میں جانتا ہوں بیگا اس جھوٹی شان کی چکر میں مقروض ہو گیا ہے' اور اب اس کی باقی زندگی یہ قرضے

اتارنے میں گزرے گی، پر اس نے بھری چوپال میں میری غیرت کو للکارا تھا، اس لیے میں روکھی سوکھی کھا کر، حلال کی اتنی کمائی جمع کر رہا ہوں کہ اتنی تو بیگے نے خواب میں بھی نہیں دیکھی ہو گی۔ میں بھلا کیسے ناغہ کر سکتا ہوں۔

بکریاں غریب لوگ پالتے ہیں۔ امیروں کے ہاں تو گائیں، بھینسیں ہوتی ہیں۔ انھیں تو اگر بکری سے کوئی دلچسپی ہے تو صرف اس لیے کہ اس کا گوشت مزیدار ہوتا ہے۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتے کہ بکریاں دودھ بھی دیتی ہیں اور یہ دودھ غریبوں کے لیے ایک نعمت سے کم نہیں ہوتا۔ پھر بکری کی مینگنیاں اگر خشک کر کے چولہے میں جلائی جائیں تو لکڑی سے بھی زیادہ روشن روشن جلتی ہیں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس گاؤں کی جتنی بھی بیوائیں ہیں ان کے ہاں ایک ایک بکری ہوتی ہے۔ وہ بڑی مشکل سے اس بکری کی چرائی دے پاتی ہیں۔ میں جب ہر مہینے ان سے بکری کی چرائی لیتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ میں ان کا گلا گھونٹ رہا ہوں۔ پر کیا کروں۔ مجبور ہوں۔ میں اگر ان سے چرائی نہ لوں تو میری اولاد کیا چرے اور نوری کا جہیز کیسی بنے۔ اس چرائی کا ایک حصہ جنگل کے داروغے کو بھی دینا ہوتا ہے۔ وہ مجھ سے چرائی لیتا ہے اور یہ چرائی سرکار کو چلی جاتی ہے۔ یہ اس کی بھی مجبوری ہے۔

آج سے چند سال پہلے جب میں شام کو جنگل سے واپس آتا تھا تو میری اولاد بکریوں کے میمنوں کی طرح "میں ـــــ میں ـــــ" پکارتی ہوئی میرے آس پاس جمع ہو جاتی تھی۔ میں انھیں جنگل سے توڑ کر لائے ہوئے بیر اور گنگیر اور ٹھٹھیر مٹھی مٹھی بھر دیتا تھا تو ان کی تو

عید ہو جاتی تھی۔ پھر جب نوری بیٹی انھیں بکریوں کا دودھ پلاتی تھی تو انھیں تو جیسے اس دودھ کا نشہ سا ہو جاتا تھا۔ وہ یوں پھیل پھیل کر سوتے تھے جیسے اپنے اپنے کھٹولے کے بادشاہ ہیں۔

نوری میری بیٹی ہے۔ میری بیوی تو آخری بیٹے میراں بخش کو جنم دیتے ہی چل بسی تھی بے چاری۔ نوری میرے بڑے بیٹے خدا بخش سے دو سال چھوٹی ہے۔ خدا بخش مدرسے میں منشی ہے اور اپنی بہن کے جہیز کی رقم جمع کرنے میں میرا ہاتھ بٹاتا ہے۔

جس روز میری بیوی اگلے جہان کو سدھاری، اس روز مجھ سے ناغہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ میں اپنے دکھ میں بکریوں والوں کا دکھ بھی بھوگتا رہا کہ گھروں آنگنوں میں بندھی ہوئی یہ بکریاں ممیا ممیا کر کیا کیا قیامتیں نہیں ڈھا رہی ہوں گی۔ اسی لیے جب میں بیوی کو دفنا چکا تو ریوڑ کو جمع کر کے جنگل میں چھوڑ آیا۔ فاتحہ کی چٹائی بعد میں آ کر بچھائی۔

میں ہر روز صبح سویرے نماز پڑھنے مسجد ضرور جاتا ہوں۔ مجھے فجر کی نماز پڑھنے کی عادت ہو گئی ہے۔ اگر میں یہ نماز نہ پڑھوں تو دن بھر بے چین رہتا ہوں۔ میں اس نماز میں اپنے خدا سے ملاقات کرتا ہوں۔ بعد میں جب بکریاں میرے چار طرف چر رہی ہوتی ہیں تو میں اپنے خدا سے دعائیں مانگتا ہوں۔ اور خدا میری دعا ضرور قبول کرتا ہے۔ پندرہ سولہ سال پہلے میں نے اپنی نوری بیٹی کے لیے پروردگار سے دعا کی تھی۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ربا! میری نوری اتنے تیز تاپ جوگی نہیں ہے۔ وہ تو لڑھک جائے گی۔ پروردگار نے میری سن لی اور نوری دوسرے ہی دن کلکاریاں مارنے لگی۔ میں اس نوری کی بات کر رہا ہوں جو اس وقت

میرے لیے جھاری میں پانی بھر رہی ہے اور روٹیوں میں گڑ اور پیاز اور اچار رکھ رہی ہے۔ وہ اپنے گھر کی ہو گئی تو میں تو آدھا رہ جاؤں گا۔ پر میں فجر کی نماز کے بعد خدا سے دعا مانگتا ہوں کہ میں اسے اتنی شان سے رخصت کروں کہ بیگا اور اس کے ساتھ سارا گاؤں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہ جائے کہ ایک چرواہا اپنی بیٹی کو بادشاہ زادیوں کا سا جہیز کیسے دے رہا ہے۔

میں نے بیٹے خدا بخش کے لیے بھی پروردگار سے دعائیں مانگی ہیں۔ وہ میری دعا کی برکت سے پہلی سے دوسری جماعت میں اور دوسری سے تیسری جماعت میں جا بیٹھتا ہے۔ میں اس کے لیے پٹواری بننے کی دعا مانگتا ہوں پر وہ تو دسویں جماعت پاس کر کے مدرسے میں منشی لگ گیا ہے۔ چلو ایک ہی بات ہے۔ لوگ پٹواری سے جتنا ڈرتے ہیں، منشی سے اتنا ہی پیار کرتے ہیں۔ ایک ہی بات ہے۔

نماز پڑھ کر جب میں مسجد سے گھر واپس آتا ہوں تو ایک ایسے گھروندے کے دروازے کے پاس سے بھی گزرتا ہوں جہاں کوئی بیس بائیس سال پہلے مہراں رہتی تھی۔ وہ بیاہ کر کسی دوسرے علاقے میں چلی گئی ہے۔ پر جب میں یہاں سے گزرتا ہوں تو وہ مجھے اپنے گھروندے کے دروازے میں کھڑی نظر آ جاتی ہے۔ میں حیران ہوں۔ میں تو ادھیڑ ہو رہا ہوں، پر مہراں مجھے جوان ہی نظر آتی ہے۔ اس کا چہرہ، اس کی آنکھیں، اس کے آنسو ——— سب کچھ چمک رہا ہوتا ہے اور میں اس چکا چوند میں لپٹا ہوا اس دروازے کے پاس سے گزر جاتا ہوں۔ یہاں سے گزرتے ہوئے میں نے ایک بار اس سے کہا تھا کہ مہراں! میں تیرے بغیر

مر جاؤں گا۔ اور اس نے کہا تھا کہ دارے! میں بھی تیرے بغیر مر جاؤں گی۔ اب میں جیتا جاگتا آدمی بکریاں چراتا پھرتا ہوں اور ——— اور وہ جانے کیا کر رہی ہو گی بے چاری۔ اس کے بیاہ سے دو تین دن پہلے جب وہ میرے انتظار میں، دروازے پر کھڑی تھی اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے پلک پلک بھری ہوئی تھیں تو اس وقت گلی کو خالی پا کر میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور چوم لیا۔ وہ ہاتھ اتنا ٹھنڈا ——— اتنا یخ تھا کہ مجھے اپنا اور مہراں کا بچپن یاد آ گیا۔

ہم دونوں چھ چھ سات سات سال کے ہوں گے۔ ہم دوسرے بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے جب موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ ساتھ ہی اولے بھی گرنے لگے۔ اولے برسانے والے بادل بہت گرجتے ہیں اور بجلیاں کڑکاتے ہیں۔ پر مہراں ایک ہی نڈر تھی۔ سب بچے اِدھر اُدھر پناہ لینے بھاگے پر مہراں اولے چنتی رہی اور دونوں مٹھیاں بھر کے میرے پاس یوں خوش خوش آئی جیسے موتی چن لائی ہو۔ میں نے اس کی دونوں کلائیاں پکڑ کر اس کے ہاتھوں کو جھٹکا دیا اور کہا کہ یہ اولے گرا دے۔ اس نے مٹھیاں کھول دیں اور میں نے اس کے ہاتھ چھوئے تو وہ یخ ہو رہے تھے۔ تب میں نے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں دبا دبا کر گرم کیا تھا اور کہا تھا کہ میرا بابا کہتا تھا، اتنے یخ تو مر جانے والے ہوتے ہیں۔ میرے منہ سے یہ کیسی گندی بات نکل گئی تھی۔ اللہ کرے وہ اپنے گھر میں زندہ سلامت بیٹھی ہو۔ بیاہ سے دو تین دن پہلے بھی اس کے ہاتھ ایسے ہی یخ تھے مگر میں انھیں اپنے ہاتھوں میں لے کر گرم نہ کر سکا۔ ریوڑ آگے نکل گیا تھا اور لوگ آنے جانے لگے تھے اور ہاتھوں کو گرم

کرنے میں کچھ وقت تو لگتا ہی ہے۔

جب میرے پاس اتنا روپیہ جمع ہو گیا جو بیگے نے خواب میں بھی نہیں دیکھا ہو گا تو میں نے اپنے دل میں طے کیا کہ اب نوری بیٹی کو رخصت کرنے کا وقت آ گیا ہے' سو چپکے سے تیاری کر لینی چاہیے۔ میں نے خدا بخش بیٹے کو بھی نہ بتایا کہ وہ مجھے گھر میں بٹھا کر خود جہیز کا سامان خریدنے چلا جائے گا اور بچتیں کرتا پھرے گا۔ میرا ارادہ آدھا لاکھ روپیہ لٹا دینے کا تھا۔ سو ایک روز میں نے کوئی پینتیس ہزار روپے اپنی ٹیبک میں اڑس لیے۔ پندرہ ہزار برات کی دعوت کے لیے رہنے دیئے۔ مسجد میں صبح کی نماز پڑھنے کے بعد میں نے اپنے پڑوسی خان محمد کی منت کی کہ وہ دو تین دن تک میرے ریوڑ کی دیکھ بھال کرے اور میرے جانے کے بعد ہی خدا بخش وغیرہ کو بتائے کہ میں ایک ضروری کام سے کہیں جا رہا ہوں۔ خان محمد میرا پرانا دوست ہے۔ مان گیا۔ میں بسم اللہ پڑھ کر گاؤں سے نکلا۔ میں زندگی میں پہلی بار اپنی گاؤں سے باہر جا رہا تھا۔ مجھے تو عمر بھر ہر روز گھر سے جنگل اور جنگل سے گھر کا سفر درپیش رہا۔ جنگل سے واپسی پر ہر روز کی طرح مجھے مہراں اپنے دروازے میں کھڑی نظر آتی رہی مگر وہی مشکل۔ وہ جوان کی جوان اور میں ادھیڑ عمر کا بوڑھا!

یہاں سے کئی کوس دور ایک قصبہ رویل ہے۔ میں نے سن رکھا تھا کہ اس قصبے کی دکانیں سونے چاندی کے زیوروں' ریشم کے کپڑوں اور پلنگوں کے رنگین پایوں سے بھری رہتی ہے۔ میں نے سنا تھا کہ پرانے زمانے میں بادشاہ اپنی شاہزادیوں کے بیاہ پر پلنگوں کے رنگین پائے رویل ہی کے کاریگروں سے بنواتے تھے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا تھا

کہ رویل میں جتنا بھی سامان خریدو' وہاں کے دکاندار سارا سامان خچروں اور گدھوں پر لاد کر' جہاں لے جانا ہو وہاں پہنچا دیتے ہیں۔ اللہ کا نام لے کر میں رویل کا راستہ پوچھتا چل پڑا۔

دوپہر کو میں ایک چھوٹے سے گاؤں کی ایک گلی میں سے گزر رہا تھا جب سامنے سے آتی ہوئی ادھیڑ عمر کی ایک عورت میرے سامنے رک کر مجھے پاگلوں کی طرح گھورنے لگی۔ اس کے ہاتھ اور ہونٹ کانپنے لگے اور وہ بولی۔ "یہ کہیں تم تو نہیں ہو دارے؟"

میں نے آواز کی کھنک سے اسے پہچانا۔ وہ مہراں تھی۔ چہرے پر مٹی اڑ رہی تھی اور آنکھوں میں شام اتر رہی تھی۔ "مہراں!" میں نے کہا۔ "یہ تم ہو مہراں؟ کیا یہ سچ مچ تم ہو؟"

گلی خالی تھی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا تو وہ اتنا ٹھنڈا تھا جیسے اس نے ابھی ابھی مٹھی میں سے اولے گرائے ہیں۔ اتنا یخ تو مرجانے والوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔ پر وہ تو زندہ سلامت میرے پاس کھڑی رو رہی تھی۔

وہ مجھے اپنے گھر میں لے آئی۔ مجھے ایک چارپائی پر بٹھا کر خود میرے سامنے زمین پر بیٹھ گئی اور اتنا روئی' اتنا روئی جیسے وہ ساری کی ساری آنسو بن کر بہہ جائے گی۔

میں اسے کیسے روکتا کہ آنسو تو میرے آنکھوں سے بھی بہہ رہے تھے۔ ہم دونوں کچھ دیر یونہی چپ چاپ بیٹھے' آنسوؤں کی زبان میں باتیں کرتے رہے۔ پھر ایک جوان لڑکی سر پر دو گھڑے رکھے آئی تو ہمیں اس حالت میں دیکھ کر' ٹھٹھک کر کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ مہراں نے اٹھ کر اس کے سر پر سے اوپر کا گھڑا اتارا تو دوسرا گھڑا اس نے خود اتار

کر رکھ دیا اور پھر اسی طرح ششدر مجھے دیکھنے لگی۔ تب مہراں بولی۔ "یہ میری بیٹی مریاں ہے دارے۔ بس یہی ایک میری بیٹی ہے۔ اس کا باپ سدھار چکا ہے۔ چرس پی پی کر اور افیون کھا کھا کر اس نے اپنا گلا اپنے ہاتھوں سے گھونٹا اور چل دیا۔ میں گاؤں کے اکا دکا کھاتے پیتے گھروں میں محنت مزدوری کر کے بیٹی کا اور اپنا پیٹ پال رہی ہوں۔ اس کے سر پر ہاتھ رکھ دے دارے۔"

میں نے مریاں کی طرف دیکھا تو یکایک وہ دروازے میں کھڑی مہراں بن گئی۔ ہو بہو مہراں۔ پھر میں نے اپنا سر جھٹکا۔ مریاں کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا تو مہراں بولی۔ "جا بیٹی اندر جا کر بیٹھ۔ مجھے دارے سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔"

لڑکی اندر چلی گئی تو مہراں نے دونوں ہتھیلیوں سے اپنے چہرے کے آنسو پونچھے اور بولی۔ "میں نے تم سے کہا تھا دارے کہ میں تیرے بغیر مر جاؤں گی۔ مگر میں بے حیا تو زندہ ہوں۔"

میں نے کہا۔ "مہراں میں نے بھی تو تم سے یہی کہا تھا اور میں بھی تو تیرے بغیر بے شرمی سے زندہ ہوں۔ بعض انسان یوں زندہ رہتے ہیں جیسے عمر قید کی سزا کاٹ رہے ہوں۔ ہم دونوں عمر قید کاٹ رہے ہیں مہراں۔"

مہراں بولی۔ "تم تو اب بھی اچھے خاصے جوان لگ رہے ہو۔ مونچھوں میں چند سفید بال آ گئے تو کیا ہوا۔ تمہارا چہرہ تو بھرے جوان کا چہرہ ہے۔ اب ذرا ادھر میری طرف دیکھو۔ ہڈیوں پر کھال منڈھی رہ گئی ہے اور بس۔ نشئی گھر والے نے میری آدھی صحت کا بیڑا غرق کیا اور

باقی آدھی اس فکر نے کھا لی کہ میں اپنی اکلوتی بیٹی کو خالی ہاتھ کیسے رخصت کروں۔ شکل صورت کی اچھی ہے اس لیے ایک جگہ اس کی منگنی تو کر دی ہے پر اب لڑکے والے کہتے ہیں کہ زیور اور کپڑے اور توا پرات کے بغیر اگر ہم لڑکی بیاہ لائے تو شریک کہیں گے کہ کہیں سے بھکارن اٹھا لائے ہیں۔ وہ کہتے ہیں لگ بھگ بیس ہزار کا جہیز ہونا چاہیے اور مجھ بد بخت کے پاس تو بیس روپے بھی نہیں۔ سو دیکھنا دارے۔ یہ لڑکی چند سال میں مجھ سے زیادہ بوڑھی ہو جائے گی۔ بس اس روگ نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا۔"

وہ جیسے مجھے بولنے کا موقع دینے کے لیے چپ ہوئی۔ میں کچھ دیر خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔ وہ چونک کر بولی۔ "تم کہیں میرے رونے سے تو نہیں گھبرا گئے دارے؟ پر ابھی تو میں آدھا بھی نہیں روئی جتنا مجھے تمہارے سامنے رونا چاہیے تھا۔" پھر وہ کچھ رک کر بولی۔ "اور مجھ بد بخت نے تم سے لسی پانی کا بھی نہیں پوچھا۔ اپنا ہی رونا لے کر بیٹھ گئی۔" پھر وہ پکاری۔ "اے مریاں۔ ادھر آ بیٹی۔ میری بات سن۔"

اور جب تک مریاں باہر آتی' میں فیصلہ کر چکا تھا۔ اس فیصلے سے مجھے ایسا لطف آیا جیسے میں نے ایک بار پھر صبح کی نماز پڑھ لی ہے۔ جیسے پروردگار نے میری ساری نمازیں قبول کر لی ہیں۔ میں نے ایک ایسا جھوٹ بولنے کا فیصلہ کر لیا تھا جس پر کتنے ہی سچ قربان کیے جا سکتے ہیں۔ یہ فیصلہ کر کے میں اتنا خوش' اتنا ہلکا پھلکا ہو گیا تھا کہ مسکرانے لگا۔

مہراں میری مسکراہٹ دیکھ کر چونکی۔ "کیوں دارے؟" اس نے حیران ہو کر سرگوشی سی کی۔ "کیا بات ہے؟"

مریاں آ چکی تھی۔ میں نے اسے اپنے قریب بٹھا کر کہا۔

"مہراں۔ تم سمجھتی ہو میں تمھارے حال سے بے خبر رہا؟ میں تو اپنے گاؤں میں بیٹھا اور اپنے ریوڑ کے پیچھے چلتا' تم پر سے گزرتی ہوئی ایک ایک آفت کو دیکھتا رہا ہوں اور سوچتا رہا ہوں کہ کاش میں تمھارے کسی کام آ سکتا۔ پر میں کرتا بھی کیا۔ عورت مرد کا رشتہ اتنا نازک ہوتا ہے کہ میں نے سوچا کہیں میں تمھاری زندگی کی بربادی کا سبب نہ بن جاؤں۔ اسی لیے دور دور سے دیکھتا اور سنتا اور پوچھتا رہا۔ مجھے معلوم تھا۔ تم ایک لڑکی کی ماں ہو اور تمھارا گھر والا نشہ کرتے کرتے مر چکا ہے۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ تم نے مریاں کی منگنی کر دی ہے پر غریبی نے تمھارے پاؤں میں بیڑیاں ڈال رکھی ہیں۔ اسی لیے تم ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتیں۔"

پھر میں نے سچ بولنا شروع کیا۔ "دیکھو مہراں۔ مریاں تمھاری بیٹی ہے تو میری بیٹی بھی تو ہے۔ اور میری نوری میری بیٹی ہے تو تمھاری بیٹی بھی تو ہے۔ اور مریاں دو چار سال بڑی ہے نوری سے' اس لیے مجھ پر پہلا حق تو مریاں بیٹی کا ہوا نا۔ کیوں مریاں بیٹی؟"

اور مریاں میرے قریب بیٹھی تنکے سے مٹی کریدتی رہی۔

مہراں پھر سے رونے لگی تھی۔ بولی۔ "میں سمجھی تھی کہ تم نے میری کوئی سار نہ لی اور تم بھی عام مردوں کے سے مرد نکلے۔ ہائے میں بدبخت تمھارے خلاف کیسی کیسی باتیں سوچتی رہی۔"

میں نے اطمینان سے ٹیبک کھولی اور نوٹوں کی تھبّی مہراں کی طرف بڑھا دی۔ "یہ پینتیس ہزار روپے ہیں۔ پچیس ہزار میری مریاں

بیٹی کے جہیز کے اور دس ہزار برات کی دعوت کے۔"

مہراں گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ "ہائے دارے۔ تم یہ کیا کر رہے ہو؟ اپنی بیٹی کا حق میری بیٹی کو ——"

"تو کیا تمھاری بیٹی میری بیٹی نہیں ہے؟" میں نے مہراں کا یخ ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور اسے نوٹوں کی تھبّی تھما دی۔ ساتھ ہی میں نے کہا۔

"دیکھو مہراں —— میں تو نقد سودا کر رہا ہوں۔"

"نقد سودا؟" مہراں کے آنسوؤں سے بھیگے چہرے پر حیرت چھا گئی۔ "نقد سودا کیسے؟"

"سنو میں نے کہا۔ "مریاں کا باپ نہیں ہے نا؟ تو یہ تمھارے سامنے کون بیٹھا ہے؟ یہ تمھاری مریاں کا باپ ہے۔" اور میں نے بازو پھیلا کر مریاں کو اپنے ساتھ لگا لیا۔۔ "اور وہاں گاؤں میں نوری کی ماں نہیں ہے نا؟ تو مہراں۔۔ تمھاری صورت میں اسے ماں مل گئی ہے۔ یہ نقد سودا نہیں ہے تو کیا ہے۔!"

✳

ایک یک لباس آدمی

تھرڈ ورلڈ ریستوران کی لمبی چوڑی کھڑکیوں میں لمبے چوڑے شیشے نصب تھے۔ ریستوران کے اندر بیٹھے ہوئے بھی یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے ریستوران کے باہر بیٹھے ہیں۔ یہاں دوسرے ریستورانوں کے مقابلے میں ایک عجیب فراخی کا احساس ہوتا تھا۔ سڑک کا سارا منظر سامنے تھا۔ دوہری کھلی سڑک پر سے گزرتا ہوا ٹریفک' چوڑے فٹ پاتھ پر ٹہلتے ہوئے ہر عمر کے لوگ' کاروں میں سے اترتے ہوئے مرد اور عورتیں اور بچے' ہر کار کے آس پاس منڈلاتے ہوئے ہر صنف کے بھکاری' بجلی کی رفتار سے موٹر سائیکل چلانے والے نوجوان جنھوں نے گردنوں پر اتنے بال جمع کر رکھے تھے کہ عقب سے لڑکیاں معلوم ہوتے تھے —— غرض سبھی کچھ نظر آتا تھا۔

ریستوران کی آخری کھڑکی کے پاس بیٹھنا میرا معمول تھا۔ چند شامیں مسلسل بیٹھنے کے بعد مجھے محسوس ہوا تھا کہ بیرونی منظر کے چند کردار ایسے بھی ہیں جو مجھے ہر روز' ایک ہی قسم کے معمول پر کاربند

دکھائی دیتے ہیں۔ ایک تو وہ نیلی نیکر والا گلگتی تھا جو بلاناغہ' دونوں ہاتھوں میں پانی سے چھلکتی بالٹیاں لٹکائے میرے سامنے سے گزر جاتا تھا۔ وہ مجھے بالٹیوں کے بغیر کبھی نظر نہیں آیا۔ جیسے بعض لوگ چاندی کے ان چمچوں کے بغیر نظر نہیں آتے جو وہ منہ میں لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ پھر ایک بوڑھا کنگھیاں بیچنے والا تھا جو کنگھی کم بیچتا تھا اور بھیک زیادہ مانگتا تھا۔ بھیک مانگتے مانگتے اس کی باچھیں مستقل طور پر لٹک پڑی تھیں اور انھوں نے اس کی ٹھوڑی کو جیسے قوسین میں لے لیا تھا۔ ایک روز اس نے ایک گنجے بزرگ کو' جو کار میں سے اتر رہے تھے' ان کی خواتین کے سامنے کنگھی خریدنے کو کہا تو وہ اس پر جھپٹ پڑے۔ میں لپک کر باہر گیا اور بوڑھے کو ان کی زد سے یہ کہہ کر بچایا کہ کنگھی بیچنا اس کی عادت ہے چنانچہ وہ آگے پیچھے نہیں دیکھتا' بس کنگھی پیش کر دیتا ہے۔

تیسرے مستقل کردار نے مجھے یوں متوجہ کیا کہ وہ مجھے ہمیشہ ایک ہی لباس میں نظر آیا۔ عجیب عجیب تصویروں والی پتلون کے اوپر چوڑی چوڑی سرخ اور نیلی دھاریوں والی بشرٹ ! میں ہر روز اس خیال سے اس کا منتظر رہتا تھا کہ ممکن ہے آج اس نے لباس بدل رکھا ہو' مگر وہ ہر روز اسی لباس میں وارد ہوتا۔ جی چاہتا اس سے پوچھوں کہ کیا تمھارے پاس کوئی اور پتلون' کوئی اور بشرٹ نہیں ہے؟ یا چلو شلوار قمیض سہی' دھوتی کُرتا سہی —— مگر اس کے تیور ایسے گمبھیر اور بھرپور تھے اور وہ ہمیشہ اتنا بہت سا سنجیدہ نظر آتا تھا کہ میں اس سے اس کی یک لباسی کا سبب نہ پوچھ سکا۔

کئی بار ایسا ہوا کہ میں ریستوراں کی کھڑکی کے پاس کرسی پر

جونہی بیٹھا تو مجھے محسوس ہوا کہ میں اس یک لباس شخص کا انتظار کر رہا ہوں۔ اس کی راہ تکتے تکتے میں پریشان ہو جاتا اور چائے میرے سامنے پڑے پڑے ٹھنڈی ہو جاتی۔ پھر میں اپنا تجزیہ کرنے لگتا کہ آخر میرا اس کا رشتہ ہی کیا ہے۔ وہ ایک معمولی درجے کا مزدور ہے۔ وہ دکان کے سامنے، فٹ پاتھ کے حاشیئے پر رکنے والی ہر موٹر کار سے مشروبات کے آرڈر لیتا ہے اور انھیں بوتلیں تھما کر ان کے خالی ہونے کا انتظار کرتا ہے۔ پھر جب وہ خالی بوتلیں سمیٹتا ہے اور ان کے دام وصول کرتا ہے تو ایک دو روپے اپنی جیب میں ڈال لیتا ہے کہ یہ شاید وہ بخشش ہوتی ہے جسے مہذب زبان میں ٹپ کہتے ہیں۔ کئی بار ایسا بھی ہوا ہے کہ رقم وصول کرنے کے بعد اس کا ہاتھ اپنی جیب کی طرف نہیں بڑھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اسے ٹپ کی رقم نہیں ملی۔ تب وہ چند لمحوں کے لیے جیسے سکتے میں کھڑا رہ جاتا ہے اور پیچھے ہٹتی اور پھر تیزی سے مڑ کر غائب ہوتی کار کی طرف ۔یوں دیکھتا رہ جاتا ہے جیسے وہ ابھی پلٹ کر آئے گی اور اسے اس کا حق ادا کر جائے گی۔ مگر پھر وہ دکان پر جا کر خالی بوتلیں اور ان کے دام مالک کے حوالے کرنے کے لیے فٹ پاتھ کی چوڑائی طے کر جاتا ہے۔

کھڑکی میں سے میں جب بھی کسی کار کو اِس طرف کا رخ کرتے دیکھتا تو میرا جی چاہتا کہ وہ پان سگریٹ اور مشروبات کی اسی دکان کے سامنے رکے جہاں یہ سرخ اور نیلی دھاریوں والی بشرٹ میں ملبوس شخص مزدوری کرتا ہے۔ اور جب کوئی کار وہاں رکے بغیر آگے نکل جاتی تو مجھے یوں کوفت محسوس ہوتی جیسے خود میری حق تلفی ہو گئی ہے۔ اس شخص

کے ساتھ میں نے جو تعلقِ خاطر پیدا کر لیا تھا، وہ ایک طرح کی رشتہ داری میں بدلا جا رہا تھا۔ بظاہر عجیب سی بات ہے کہ ایک ریستوڑاں کی کھڑکی سے جو شخص مجھے عموماً نظر آتا ہے، اس کے ساتھ اتنی قربت پیدا ہو جائے مگر یہ قربت آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔ مجھے کئی باریوں بھی لگا کہ مشروبات کی بوتلیں گاہکوں کو دیتے یا واپس لیتے وقت، وہ ایک نظر مجھ پر ڈال لیتا ہے، مگر پھر میں سوچتا کہ اس رخ پر تو ریستوران کی آٹھ کھڑکیاں ہیں۔ کیا یہ ضروری ہے کہ وہ میری طرف ہی دیکھ رہا ہو۔

ایک روز میں ریستوراں میں پورے دو گھنٹے بیٹھا اس کے دکھائی دینے کا انتظار کرتا رہا مگر وہ دکھائی نہ دیا۔ جو کاریں فٹ پاتھ کے حاشیئے کے پاس رکتی تھیں، ان سے ایک ٹھنگنا نوجوان آرڈر لے رہا تھا۔ میں سارا وقت بے چین رہا کہ آخر وہ یک لباس شخص کہاں گیا۔ میں جب ریستوراں سے نکلا تو سیدھا مشروبات کی اس دکان پر پہنچا اور اس نوجوان سے پوچھا۔ "یہاں جو شخص روزانہ کام پر آتا تھا اور جس کی جگہ آج تم کام کر رہے ہو، وہ کیوں نہیں آیا؟"

نوجوان بولا۔ "آپ چاچا کریم بخش کا پوچھ رہے ہیں نا؟"

میں نے کہا۔ "مجھے نام معلوم نہیں۔ وہ جو ہمیشہ بڑی بڑی لال اور نیلی دھاریوں والی بشرٹ پہنتا ہے——"

نوجوان بولا۔ "جی وہی۔ چاچا کریم بخش۔ کبھی کبھی اسے کوئی ضروری کام پڑ جائے یا وہ بیمار ہو جائے تو نہیں آتا۔ آج بھی کوئی ایسی ہی بات ہو گی ورنہ یہی تو چاچے کا روزگار ہے۔"

جی چاہا کریم بخش کا اتا پتا پوچھوں، مگر نوجوان رکتی ہوئی ایک

کار کی طرف بڑھ گیا اور میں گھر چلا آیا۔

وہ رات میں نے خاصی پریشانی میں گزاری' جیسے میری زندگی کے معمول میں ایک غیر معمولی رخنہ پڑ گیا ہو۔ میں نے طے کر لیا کہ کل مشروبات کی دکان کے مالک سے کریم بخش کے بارے میں تفصیل معلوم کروں گا اور اس کے گھر جا کر اس کے کسی کام آنے کی کوشش کروں گا' مگر دوسرے روز ابھی میں ریستوراں میں داخل بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ ایک کار کے پاس کھڑا' خالی بوتلیں سمیٹتا اور بل وصول کرتا نظر آ گیا۔

اسے دیکھتے ہی میرے دماغ پر سے ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا اور ریستوراں کے اندر' کھڑکی کے شیشے میں سے کریم بخش کو اپنے روزانہ کے کام میں مصروف دیکھتا رہا۔ ایک دو بار اس نے جیسے میری طرف بھی دیکھا' مگر میرے قریب والی کھڑکی کے پاس بھی تو لوگ بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ ممکن ہے کریم بخش نے انھیں دیکھا ہو جب کہ ان میں دو ایسی چمک دار سی لڑکیاں بھی شامل تھیں جن کی طرف پارسا سے پارسا آدمی کی نظریں بھی بے ساختہ اٹھ جاتی ہیں۔

دوسرے روز صبح صبح ہی مجھے راولپنڈی سے فون پر اطلاع ملی کہ ابا جی کو دل کا دورا پڑا ہے اور وہ ہسپتال میں منتقل کر دیے گئے ہیں۔ میں نے فوراً راولپنڈی کا رخ کیا اور اباجی کی دیکھ بھال اور پھر ان کی صحت کی بحالی کے انتظار میں مجھے وہاں ڈیڑھ پونے دو ماہ رکنا پڑا۔

واپس آتے ہی شام کو میں نے تھرڈ ورلڈ ریستوراں کی راہ لی۔ میری خاص کھڑکی کے پاس ایک صاحب اور ایک خاتون چائے پینے کے بعد بل ادا کر رہے تھے۔ میں ریستوراں کے اندر چلا گیا۔ مجھے دیکھتے ہی

کاؤنٹر کے پاس بیٹھا مینجر اٹھا۔ مجھ سے مصافحہ کیا اور بولا۔ "ہم لوگ تو پریشان ہو گئے تھے کہ صاحب کہاں گئے۔ سب کو تشویش تھی مگر یہ باہر پان سگریٹ اور مشروبات کی دکان پر کام کرنے والا چاچا کریم بخش ہے نا' اس نے تو آپ کے بارے میں پوچھ پوچھ کر جان عذاب میں کر دی۔ نہ جانے اسے آپ سے کیا کام ہے۔ باہر ملاقات ہوئی آپ سے؟"

میں نے کہا۔ "وہاں تو وہ مجھے نظر نہیں آیا۔"

مینجر بولا۔ "ابھی آ جائے گا۔ اس سے ضرور مل لیجیے گا۔ کسی وجہ سے بہت بے چین ہے۔"

جب تک میری نشست پر بیٹھے ہوئے صاحب بل ادا کرنے کے بعد اٹھتے' میں سوچتا رہا کہ اسے مجھ سے ایسا کون سا ضروری کام ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے اسے کوئی سفارش درکار ہو۔ شاید اسے اپنا لباس بدلنے کی سوجھی ہو اور اس سلسلے میں اسے کچھ رقم کی ضرورت ہو۔ شاید وہ کسی بہتر روزگار کا متمنی ہو اور اس نے مجھ سے توقعات وابستہ کر رکھی ہوں۔

نشست کے خالی ہوتے ہی میں کرسی پر جا بیٹھا اور باہر نظر ڈالی تو وہی سرخ اور نیلی دھاریوں والی بشرٹ پہنے کریم بخش ایک کار والوں سے خالی بوتلیں اور ان کے دام لے کر پلٹا۔ پلٹتے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ دونوں ہاتھوں میں تھامی ہوئی بوتلوں سمیت کھڑکی کی طرف یوں جھپٹا جیسے شیشہ توڑ کر اندر چلا آئے گا۔ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سی نکل کر' دریا میں آنے والے سیلاب کی طرح' اس کے سارے چہرے پر پھیل گئی تھی۔ پھر اچانک اس نے ارادہ بدلا' پلٹا اور زیادہ سے زیادہ

پندرہ بیس سیکنڈ کے اندر، اسی ہمہ جہت مسکراہٹ کے ساتھ ریستوران کے اندر آ کر میری طرف بڑے تپاک سے بڑھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے میرے قریب آ کر مصافحے کا وقفہ بھی برداشت نہیں کیا اور بولا۔ "آپ کہاں چلے گئے تھے صاحب جی؟ آپ کہیں بیمار تو نہیں ہو گئے تھے؟ کوئی ضروری سفر کرنا پڑ گیا تھا کیا؟ کیا ہوا تھا صاحب جی؟ آپ کو کیا ہوا تھا؟" سارے چہرے پر آئے ہوئے مسکراہٹ کے سیلاب کے باوجود اس کی آواز بھرا گئی اور آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ "میں نے تو اِن دنوں جب بھی یہاں آپ کی کرسی پر کسی اور کو بیٹھے دیکھا تو جی چاہا —— میرا جی چاہا صاحب جی، کہ اس سے کہوں کہ آپ ہوتے کون ہیں یہاں بیٹھنے والے؟ یہاں تو صرف ہمارے صاحب جی بیٹھتے ہیں۔ صاحب جی آپ ٹھیک ٹھاک ہیں نا؟ ٹھیک ٹھاک ہیں نا آپ؟"

میں سوچ رہا تھا کہ اس اپنائیت اور محبت کی تمہید کے بعد کریم بخش مجھے وہ کام بتائے گا جس کے لیے اسے میرا اتنی شدت سے انتظار تھا، مگر وہ بولا۔ "یہاں آدمی تو دن میں سیکڑوں ملتے ہیں صاحب جی، پر پیار سے دیکھنے والی آنکھیں مجھے اس کھڑکی میں سے ہی دکھائی دیتی تھیں —— اور آج کل کون کسی سے پیار کرتا ہے صاحب جی!"

پیپل والا تالاب

جب میں ۱۹۴۷ء میں اعلانِ آزادی سے چار چھ ماہ پہلے، روزگار کے سلسلے میں عازمِ انگلستان ہوا تھا تو میرے پہاڑی گاؤں کے قریب، کچی سڑک کے ایک طرف، بڑی بڑی چٹانوں میں گھرے ہوئے پیپل والے تالاب پر ایک ہندو سادھو کا قبضہ تھا۔ یہ کوئی بڑا تالاب نہیں تھا۔ محدود سا رقبہ تھا۔ اس کے وسط میں ایک ٹیلا سا تھا جس پر تالاب کے کنارے کا چھتنار پیپل سایہ کیے رہتا تھا۔ ٹیلے پر ایک چھوٹی سی کوٹھریا تھی جس کے دروازے پر ایک سادھو، ماتھے پر موٹا اور لمبا سیندوری تلک لگائے، وقفے وقفے سے "الکھ نرنجن الکھ نرنجن" کے نعرے سر کرتا رہتا تھا۔ دو اسلحہ بند چوکیدار وہاں ہر وقت موجود رہتے تھے۔ ان میں سے ایک ہندو اور ایک سکھ تھا۔ تالاب پر ہندو دیویاں آتی رہتی تھیں۔ وہ سادھو کے سامنے ہاتھ جوڑ کر اور آنکھیں بند کر کے کھڑی ہو جاتی تھیں اور زیرِ لب کوئی جاپ کرتی رہتی تھیں۔ دن بھر ان کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ یہ دیویاں سادھو کی معرفت بھگوان سے اولاد مانگنے آتی تھیں اور اگر ٹیلے پر بیٹھا سادھو اپنے آس پاس اگی ہوئی جھاڑیوں سے پھول

توڑ کر اور الکھ نرنجن کا نعرہ لگا کر کسی دیوی کی طرف یہ پھول اچھال دیتا تھا تو دیوی کو یقین ہو جاتا تھا کہ وہ عنقریب ماں بنے گی!

گاؤں میں غالب اکثریت تو مسلمانوں کی تھی مگر پیپل والے تالاب پر ہندوؤں کا قبضہ تھا۔ مشہور تھا کہ یہ تالاب صدیوں پہلے ایک عام سا جوہڑ تھا۔ پھر چندر گپت موریا نے اس کے چار طرف پختہ سیڑھیاں تعمیر کرائی تھیں۔ آخری سیڑھی سے ایک بے ڈھب سی پلیا ٹیلے تک جاتی تھی۔ یہ سادھو کے آنے جانے کا رستہ تھا۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ ٹوٹی پھوٹی سیڑھیوں کے رخنوں میں اگی ہوئی جنگلی جھاڑیوں کے گہرے سبز پتوں اور گہرے سرخ پھولوں کو ہاتھ لگائے۔ یہ حق صرف سادھو مہاراج کا تھا۔ ایک بار ایک اجنبی مسافر نے، جو مسلمان تھا، ان جھاڑیوں کے حسن کی زد میں آگیا اور بے خبری میں ایک پھول توڑ بیٹھا۔ ہندو چوکیدار چھرا نکال کر اس پر لپکا اور سکھ چوکیدار چھوی سنبھالتا ہوا اپنے ساتھی کی مدد کو بڑھا، جب کسی بزرگ یاتری نے کہا کہ "بھائیو! یہ آدمی کوئی پردیسی لگتا ہے۔ اسے پتہ نہیں ہوگا کہ آکاش کی ان جھاڑیوں سے پھول توڑنا مہا پاپ ہے۔ اسے معاف کر دو اور جانے دو ـــــ اور اے بھائی مسافر! یہ پھول تالاب میں پھینک دے ورنہ اُس موڑ تک پہنچنے سے پہلے ہی بھوت پریت تیری گردن مروڑ ڈالیں گے۔"

گاؤں کے ایک پڑھے لکھے جہاندیدہ شخص نے تحقیق کر کے ثابت کیا تھا کہ مدتیں گزریں اس نگری پر چندر گپت موریا راج کرتا تھا۔ ایک دن وہ دوسرے راجاؤں کی طرح شکار کھیلنے نکلا اور ایک ہرن کے تعاقب میں اِدھر سے گزرا۔ اُس وقت چند جوان لڑکیاں تالاب کے

کنارے، کولھوں پر اٹھائی اور سروں پر رکھی مٹی کی گاگریں اتار رہی تھیں۔ وہ تالاب سے پانی بھرنے کو جھکیں تو ایک لڑکی کا پاؤں رپٹا اور وہ اس زور سے گری کہ کلائی کی چوڑیاں ٹوٹ کر اس کی کھال میں دھنس گئیں۔ اس کی گاگر بھی تالاب میں گر کر تیرتی ہوئی دوسرے کنارے کی طرف جانے لگی۔ چندر گپت کو یہ منظر بہت بھایا۔ اس نے روتی ہوئی زخمی لڑکی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس سے ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کی تعداد پوچھی تو بسورتی ہوئی لڑکی بولی۔ "پانچ۔" تب راجہ نے گاؤں کے مکھیا کو بلایا اور اسے حکم دیا کہ پانچ دن کے اندر تالاب کے چاروں طرف پتھروں یا اینٹوں سے پانچ سیڑھیاں تعمیر کر دی جائیں تاکہ کنیاؤں کو پانی بھرنے میں تکلیف نہ ہو۔ راجہ نے مکھیا کو خبردار کیا کہ اگر پانچ دنوں کے اندر یہ پانچ سیڑھیاں تیار نہ ہوئیں تو پانچ کی گنتی پوری کرتے ہوئے، اسے اور اس کے اہل خانہ کے چار افراد کو کولھو کے شکنجے میں ڈال دیا جائے گا۔ اس کے بعد چندر گپت موریا نے پانچوں لڑکیوں کو پانچ پانچ اشرفیاں دیں اور چل دیا۔ مکھیا نے سارے گاؤں کو بیگار پر لگا کر پانچ دن چھوڑ، ایک ڈیڑھ دن ہی میں، پختہ اینٹوں سے پانچ سیڑھیاں تعمیر کر دیں مگر پھر راجہ اس طرف نہ آسکا۔ شاید ہرن بہت دور نکل گیا تھا۔

یہ تالاب اونچی اور عمودی چٹانوں میں گھرا ہوا تھا۔ گاؤں کی طرف جانے والی کچی سڑک انہی کے پاس سے گزرتی تھی۔ کہتے ہیں کبھی کبھی تالاب کے اندر سے ایک آواز آتی تھی جو صرف رات کے سناٹے میں سنی جاسکتی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کہیں دور، پاتال میں چکی چل رہی ہے یا ٹین کی چادروں پر ریت کے انبار مسلسل سرکتے جا رہے ہیں۔ عام

خیال کے مطابق تالاب کا پیپل دراصل بھوتوں کا اڈا تھا۔ سوجھ بوجھ والے لوگوں کا کہنا تھا کہ تالاب کی سطح پر تیرتے ہوئے گول گول دائرے، جو دھوپ نکلتے ہی دھنک کے رنگوں میں رنگ جاتے تھے تو یہ قدرت کے اشارے تھے کہ اس تالاب کے بہت نیچے تیل کا ذخیرہ ہے۔ عام لوگ اس طرح کی باتیں سنتے تھے تو پڑھے لکھوں کی جہالت پر خوب ہنستے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ دائرے، جو تیل کی تلور سی دکھائی دیتے تھے، بھوتوں کے بچوں کے کھلونے تھے۔ ایک بار ایک پڑھے لکھے نے جھک کر، ان دائروں میں سے ایک دائرے کو ہاتھ بھر کر لکڑی کی نوک پر اٹھانا چاہا تو تالاب میں یوں سر کے بل جا گرا جیسے کسی نے اسے دھکا دیا ہے۔ تب سے کسی کی مجال نہیں تھی کہ ان دائروں کو چھیڑے۔ اگر کوئی ناواقف ان دائروں کی طرف ہاتھ بڑھاتا تو سادھو جیسے خوفزدہ ہو کر اٹھ کھڑا ہوتا اور "نہ نہ، نہ نہ" کا شور مچا دیتا اور تھر تھر کانپنے لگتا اور اپنی انگارہ سی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کہتا۔ "بھوتوں کو مت جگاؤ۔ یہ سوئے رہیں تو بہتر ہے۔ الکھ نرنجن۔ الکھ نرنجن۔"

میرا ایک ہندو دوست مکند لعل اسی علاقے کے ایک اور گاؤں میں رہتا تھا۔ میرا کالج فیلو تھا، گریجویٹ تھا اور بہت منطقی گفتگو کرتا تھا، مگر ایک روز جب میں اس کے ہاں گیا تو وہ اپنے ننھے سے بیٹے کو اٹھا لایا اور یہ بتا کر مجھے حیران کر دیا کہ ——— "تمہارے گاؤں کے پیپل والے تالاب کے سادھو مہاراج نے ایک پھول توڑ کر میری پتنی کی طرف پھینکا تھا تو تمہارا یہ بھتیجا پیدا ہوا۔"

میں نے کہا۔ "مکند۔ اگر بچے اتنی آسانی سے پیدا ہونے لگتے تو

شادی بیاہ کا ادارہ ہی ختم ہو جاتا۔ سادھو مہاراج کی اپنی تو کوئی آل اولاد ہے نہیں ورنہ ان کی کوٹھریا کے کہیں آس پاس تو دکھائی دیتی۔ اور وہ دوسروں کی طرف پھول اچھال کر اولادیں بانٹتے پھرتے ہیں۔ عقل کے ناخن لو۔ تم نے آخر یہ کیسے سوچ لیا کہ تمہاری پتنی کی طرف سادھو کا اچھالا ہوا پھول آیا تو اس کے پیٹ میں بچہ پرورش پانے لگا؟"

یہ کہہ کر میں نے قہقہہ لگایا کہ مکند بھی میرا ساتھ دے گا مگر وہ کچھ ایسی سنجیدگی سے بولا جس میں ناگواری کا تاثر چھپائے نہیں چھپ رہا تھا اور جیسے میں نے اس کے دھرم پر حملہ کر دیا تھا۔ کہنے لگا۔ "تمہیں میرا مشورہ ہے کہ جب تم شادی کر لو اور چار پانچ سال تک تمہارے ہاں بچہ نہ ہو تو بیوی کو ساتھ لے کر اپنے گاؤں کے اس تالاب کی طرف آنا اور پھر دیکھنا کہ بھگوان تمہاری اِچھا کیسے پوری کرتے ہیں۔ یہ مٹی جس پر تم کھڑے ہو نا، اس سے ذرا اوپر ابھر کر دیکھو تو تمہیں ایک اور دنیا نظر آئے گی۔ سادھو مہاراج اسی اوپر والی دنیا سے آئے ہیں۔"

انگلستان جا کر میں ایک دوست کی مدد سے محنت مزدوری کرنے لگا۔ مکند کو خط بھی لکھا کہ اُدھر میرے گاؤں کی طرف جانا تو پیپل والے تالاب پر جا کر سادھو مہاراج کو میرے سلام کہنا اور پوچھنا کہ مزاج اچھے ہیں آپ کے؟ مکند کا جواب آیا کہ پہلے شادی کرو، پھر سادھو مہاراج کو سلام بھجوانا۔

میں وہیں تھا جب پاکستان قائم ہوا اور میں اپنے چند پاکستانی دوستوں کے ساتھ لندن کی سڑکوں پر ناچتا پھرا۔ پھر مجھے ہوزری کے کارخانوں کی مصنوعات شہر بھر کے سٹوروں اور دکانوں پر پہنچانے کا کام

ملا اور میں ہر ماہ خاصی معقول رقم کمانے لگا۔ میں نے وہیں ایک پڑھے لکھے پاکستانی گھرانے میں شادی بھی کر لی۔

مکند لعل اعلان آزادی کے بعد شرنارتھی کی حیثیت میں انبالہ، دہلی اور لکھنؤ میں بھٹکتا ہوا الہ آباد پہنچا اور وہاں اسے ایک سکول میں نوکری مل گئی۔ ہمارے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ میں نے اسے اپنی شادی کی اطلاع دی تو اس نے مبارکباد کا خط بھیجا اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ اگر تین چار سال تک اولاد نہ ہو تو پاکستان میں اپنے علاقے کے پیپل والے تالاب کو یاد رکھنا۔ اگر سادھو مہاراج بھی میری طرح شرنارتھی بن کر ادھر نہ آنکلے تو وہ تمہاری بیوی کی طرف پھول ضرور اچھالیں گے۔"

میں نے جواب میں اس کی توہم پرستی کا مذاق اڑایا مگر چار برس تک میری بیوی کی گود ہری نہ ہوئی تو مجھے مکند لعل اور پیپل والا تالاب اور سادھو مہاراج یاد آنے لگے۔ میں نے بیوی سے اس کا ذکر کیا تو وہ ہنستے ہنستے بے حال ہوگئی۔ مشکل سے ہنسی پر ضبط پاتے ہوئے بولی۔ "اگر یہ بات ہے تو آپ یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہیں؟ پاکستان چلے جائیے۔ یورپ اور امریکہ کے بڑے بڑے اخباروں میں تالاب اور اس کے سادھو کے کمالات کے اشتہار چھپوائیے اور پھر دیکھئے کہ دنیا بھر کے بے اولاد آپ کے ہاں کیسے اڈ اڈ کر آتے ہیں۔ آپ تو دنوں میں کروڑ پتی ہو جائیں گے——" اور اس پر بے تحاشا ہنسی کا ایک اور دورہ پڑا۔

اگلے برس خدا نے مجھے بیٹے سے نوازا تو میں نے مکند لعل کو لکھا کہ خفا نہ ہونا، میری بیوی تو کسی سادھو کی طرف گئے بغیر ہی ایک بچے

کی ماں بن گئی ہے۔ دو سال بعد ایک اور بیٹا ہوا۔ میں انگلستان میں برسوں سے بھرپور زندگی گزار رہا تھا جب ۱۹۷۲ء میں مجھے اطلاع ملی کہ میری امی علیل ہیں اور وہ مجھے اور میرے بچوں کو دیکھنے کی خواہاں ہیں۔ میرا بڑا بیٹا کیمبرج میں تھا اور چھوٹا لندن میں تعلیم حاصل کر رہا تھا اس لیے میں نے انہیں وہیں چھوڑا اور بیوی کے ہمراہ پاکستان آگیا۔

جب بس میرے گاؤں کے رقبے میں داخل ہوئی تو شام ہوگئی تھی۔ میں نے تالاب کے قریب سے گزرتے ہوئے صرف اتنا دیکھا کہ وہاں ایک مقام پر بہت سے چراغ جل رہے تھے۔ میں نے سوچا ممکن ہے آج ہندوؤں کی دیوالی ہو ورنہ اتنے بہت سے چراغوں کا کیا مطلب!

گھر میں میری امی کی دیکھ بھال کے لیے میری چھوٹی خالہ اور ان کی ایک نوجوان پوتی موجود تھیں۔ امی سنبھل چکی تھیں۔ کہنے لگیں۔ "جو تھوڑی بہت بیماری باقی ہے وہ میں اپنے بیٹے اور بہو کو سینے سے لگا کر دور کر لوں گی۔"

صبح کو چھوٹی خالہ نے مجھے الگ لے جا کر بتایا کہ ان کی پوتی شادی کے پانچ سال بعد بھی بے اولاد ہے۔ "تم اسے سائیں جمالے شاہ کے پاس لے جاؤ۔ سنا ہے وہ بے اولاد عورتوں کو اپنی جھاڑیوں کا ایک پھول اور ایک پتا دیتے ہیں جنہیں کوٹنے اور دودھ میں ملا کر پینے سے بے اولاد کے ہاں اولاد ہو جاتی ہے۔"

سامنے دیوار کے اس پار مجھے مکند لعل بیٹھا ہنستا نظر آنے لگا۔

میں نے پوچھا۔ "پر ماسی جی۔ یہ سائیں جمالے شاہ ہیں کہاں؟"

بولیں۔ "وہ سائیں کمالے شاہ جی کے مزار مبارک کے مجاور

ہیں۔ کل شام کو تمھاری بس اس مزار شریف کے پاس سے تو گزری ہوگی۔ اس گاؤں کے ہو کر بھی کیا تم نے پیپل والا تالاب نہیں دیکھا؟ گوروں کے دیس میں رہ کر سب کچھ بھول گئے!"

"پیپل والا تالاب!" میں دم بخود رہ گیا۔ "مگر ماسی جی۔ وہاں تو ایک ہندو سادھو بیٹھا کرتا تھا۔"

چھوٹی خالہ مسکرانے لگیں۔ "ارے بھولے بیٹے! یہ سائیں کمالے شاہ، مغل بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے پیر تھے۔ سائیں جی کا مزار اورنگ زیب بادشاہ نے بنوایا تھا مگر جب مغلوں کی بادشاہی ختم ہوئی تو ہندوؤں نے مزار شریف پر قبضہ کر لیا تھا۔ مزار شریف پیپل والے تالاب کے بالکل درمیان میں تھا۔ ظالم سادھو نے اسی مزار شریف کے اوپر کوٹھریا بنا لی تھی اور وہیں بیٹھتا تھا۔ اللہ کے فضل سے پاکستان بنا تو سادھو بھاگ گیا۔ تب بڑے سائیں جی کی اولاد میں سے سائیں جمالے شاہ آئے اور اب مزار شریف کے سامنے تالاب کے کنارے بیٹھ کر بے اولادوں کو اولاد دیتے ہیں۔ تم نے بس میں سے مزار شریف پر بہت سے چراغ جلتے ہوئے بھی نہیں دیکھے بیٹا؟"

میرا جی چاہا میں گھر سے نکل کر گاؤں کی سب سے اونچی پہاڑی پر چڑھ کر اور مشرق کی طرف منہ کر کے، پھیپھڑوں کی پوری قوت سے پکاروں —— "مکند لعل —— اے بھائی مکند لعل۔ اِدھر آ۔ تجھے ایک تماشا دکھاؤں۔"

✵

چھلی

ابھی کوئلے پوری طرح دہکے بھی نہیں تھے اور داری نے مکئی کی چھلیوں کی گٹھری کھولی ہی تھی کہ "ہائے، چھلیاں!" کے نعرے کے ساتھ ایک چمکتی دمکتی کار کے پہیوں کی چیخیں نکل گئیں۔ ولی محمد اور داری نے گھبرا کر کار کو دیکھا تو کار کی طرح دو چمکتی دمکتی لڑکیاں کار میں سے نکلیں اور ایک بولی۔ "جلدی سے دو چھلیاں بھونو چاچا —— اور ایسی بھونو کہ مزا آ جائے۔" دوسری لڑکی داری کی طرف متوجہ ہوئی۔ "اچھی اچھی، لانبی لانبی، تازہ تازہ چھلیاں چُن کے دے لڑکی۔" اور پھر اس نے حیرت زدہ ہو کر اپنی ساتھی کو دیکھا اور جیسے سرگوشی میں بولی۔ "اے ستارہ۔ اِدھر اس چھلیوں والی لڑکی کو دیکھا؟ مائی گاڈ! اتنی بڑی بڑی لانبی لانبی سمندر آنکھیں" اور رضیہ نے داری پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ "سچ کہتی ہو رضیہ —— ایک دم اتنا بہت سا، ڈھیر سا انوسنس!"

پھر اس نے داری سے پوچھا۔ "تمھارا نام کیا ہے لڑکی؟"

"داری۔" وہ یوں بولی جیسے یکایک ستار کا تار جھنجھنایا ہو۔

"میری بیٹی ہے" ولی محمد نے پنکھیا کی مدد سے کوئلے دہکاتے ہوئے کہا۔

"تمھاری بیٹی ہے تو ھماری بہن ہوئی نا چاچا۔" رضیہ بولی۔ "ہم تو اس سے دوستی کریں گے۔ سہیلی بنائیں گے۔ کیوں داری، ھماری سہیلی بنو گی؟" اور داری کے جسم کا سارا خون اس کے چہرے پر جمع ہو گیا۔

وہ یوں لجا گئی جیسے کسی نے اس سے اظہارِ عشق کر دیا ہو۔

"کوئی بات نہیں" ستارہ بولی۔ "آہستہ آہستہ کُھل جائے گی۔ چاچا، ہم نے یہاں تمھیں پہلے تو نہیں دیکھا۔ تم ہر روز یہیں اسی فُٹ پاتھ پر آ کر بیٹھا کرو۔ اچھا۔"

"جی اچھا" ولی محمد بہت خوش نظر آ رہا تھا۔

رضیہ نے جھک کر بھنتی ہوئی چھلّیوں کو دیکھا۔ "ہائے دیکھو ستارہ، چھلّی کے موتیوں کے سے دانے کیسے رنگ بدلتے جا رہے ہیں۔ پہلے زرد ہوئے۔ اب لال ہو رہے ہیں۔ چاچا، دو اور چھلّیاں بھی۔ ہم ساتھ لے جائیں گے۔ کتنے پیسے؟"

ولی محمد بولا۔ "چار روپے"

"لو یہ پانچ روپے" رضیہ بولی۔ "پانچواں روپیہ داری کا ہے۔ یہ داری سے ہماری دوستی کی بسم اللہ ہے۔ کیوں داری؟"

اور داری بڑی آسودگی سے مسکرائی۔ "جی۔"

چار چھلّیاں لے کر رضیہ اور ستارہ کار میں سوار ہوئیں اور کار ایک دم یوں ذُوم سے چل دی جیسے اس نے لمبی چھلانگ لگائی ہو۔

"ھائے بابا، یہ لڑکیاں کتنی پیاری تھیں" داری بولی۔ "ریشم ہی ریشم۔ خوشبو ہی خوشبو۔ کیا شہر کی سب لڑکیاں ایسی ہوتی ہیں بابا؟"

"جس طرح ہاتھ کی پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہیں نا بیٹی، اسی طرح انسان بھی برابر نہیں ہوتے۔ کوئی اچھا، کوئی بہت اچھا۔ کوئی برا۔ کوئی بہت برا۔" ولی محمد کوئلے دہکاتے ہوئے فلسفہ بگھارنے لگا۔

"دیکھنا یہ روز آئیں گی۔"

"اللہ کرے روز آئیں اور اپنے ساتھ اور لڑکیوں کو بھی لائیں۔"

تین اور گاھک آ نکلے۔ اس کے بعد تو گاھکوں کا تانتا بندھ گیا۔ دن ڈھلے تک سب چھلّیاں بک گئیں۔ داری نے اٹھ کر وہ چادر جھاڑی جس میں چھلّیاں بندھی تھیں۔ پھر اس نے فُٹ پاتھ کی دوسری طرف جنگلے کے پار دیکھا اور بولی۔ "اُدھر دیکھو بابا۔ اتنی بہت سی رنگا رنگ موٹریں۔ صبح بسوں کے اڈے پر ایک آدمی ریڑھی میں پیوندی بیر بیچ رہا تھا نا۔ کوئی پیلے، کوئی لال، کوئی اتنے لال کہ کالے ہو رہے تھے۔ یہ موٹریں مجھے تو ریڑھی میں لگے ہوئے پیوندی بیروں سی لگتی ہیں۔"

اور ولی محمد کوئلے بجھا کر پوٹلی میں باندھتے ہوئے مسکرایا۔ "تم تو سدا کی پگلی ہو۔ کیسی کیسی بات سوچتی ہو۔ پیوندی بیر اور موٹر کاریں! کوئی سنے تو کیا کہے۔" وہ ہنسا۔

اور داری نے باپ کا ہاتھ پکڑ کر دبایا۔ "اب اِدھر دیکھو بابا۔ اِدھر تو میں نے دیکھا ہی نہیں تھا۔ اتنا بڑا مکان! اور اس کے اتنے لمبے لمبے اونچے اونچے کھمب! اس کے اندر کتنے آدمی رہتے ہوں گے بابا۔"

"میں نے کہا نا تم سدا کی پگلی ہو" ولی محمد نے مسکراتے ہوئے داری کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی۔ "اب چلو۔ جلدی سے سارا کام ہو گیا۔ اللہ نے بڑا رحم کیا۔"

"بوھنی اچھی ہوئی تھی نا" داری بولی۔ "میری سہیلیوں کی بوھنی تھی نا۔"

"کہتی تو تم ٹھیک ہو" ولی محمد نے کہا۔ "پر بیٹی۔ یہ بڑے لوگوں کی بیٹیاں ہیں۔ ہم نے دن بھر میں جو کچھ کمایا ہے نا' وہ اسے یوں چٹکی بجاتے میں خرچ کر دیتی ہیں۔"

اچھا!" داری حیران رہ گئی۔

دوسرے دن بھی رضیہ اور ستارہ کی چمکتی دمکتی کار ٹھیک اس وقت ولی محمد کے پاس آ کر رکی جب داری چھلیوں کی گٹھری کھول رہی تھی۔ کار رکنے کی آواز سنتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور رضیہ اور ستارہ کا ایسی مسکراہٹ سے خیر مقدم کیا جو دیر تک اس کے ہونٹوں پر چھائی رہی۔

رضیہ نے ستارہ کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "ہماری دوستی ہو گئی داری سے۔ دیکھو تو ہمیں دیکھ کر کتنی خوش ہو رہی ہے۔ کیوں داری؟"

"جی" داری بولی۔ "آج میں نے آپ کے لیے لانبی لانبی چھلیاں الگ سے رکھی ہیں۔ ایک ایک چھلی دو دو چھلیوں کے برابر ہے۔"

"تو پھر ہم ایک ایک چھلی کے دو دو روپے دیں گے اپنی دوست

داری کو۔" ستارہ بولی۔

"جی نہیں" داری نے نفی میں سر اور ہاتھ ہلایا۔ "ہم تو ایک ایک روپیہ ہی لیں گے۔"

"داری ٹھیک کہتی ہے۔" ولی محمد نے بیٹی کی تائید کی۔ "چھلی لمبی یا چھوٹی نہیں ہوتی۔ چھلی بس چھلی ہوتی ہے۔ اور پھر آپ تو داری کی دوست ہیں۔"

دونوں نے تحسین بھری نظروں سے دونوں کو دیکھا اور جب ولی محمد داری کی دی ہوئی چھلیاں بھوننے لگا تو رضیہ اور ستارہ نے داری سے گفتگو شروع کر دی۔

"داری تم کتنے بھائی بہن ہو؟" رضیہ نے پوچھا۔

داری بولی۔ "میرا تو نہ کوئی بھائی ہے نہ بہن ہے نہ ماں ہے۔ بس ابا ہی ابا ہے۔"

"اور ابا بھی کیا ہے۔" ولی محمد بولا۔ "اپنی اکلوتی بیٹی کو دھکے کھانے کے لیے ساتھ ساتھ لیے پھرتا ہے۔ کیا کروں بی بی۔ زمانہ الٹی چال چل رہا ہے۔ جوان بیٹی کو گھر میں اکیلا نہیں چھوڑا جا سکتا سو ساتھ لے آتا ہوں۔"

"ساتھ لاتے ہو تو اچھا کرتے ہو۔" ستارہ بولی۔ "اگر تم اسے ساتھ نہ لاتے تو اس کے ساتھ ہماری دوستی کیسے ہوتی۔ ہم اتنی پیاری سہیلی کہاں سے لاتے؟" اور ستارہ نے داری کو اپنے بازو میں لے لیا۔

پھر رضیہ نے بھی داری کو اپنے بازو میں لپیٹا اور بولی۔ "ہم یہاں قریب ہی رہتی ہیں۔ اب ہم کالج جا رہی ہیں۔ کسی روز ہم تمھیں

اپنے گھر لے جائیں گی۔ چلو گی نا؟"

داری نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ اتنی خوشی تھی کہ بس تالی بجانے کی کسر رہ گئی تھی۔

اتنے میں چھلیاں بھن گئی تھیں۔ دونوں نے دو چھلیوں کے پانچ روپے دیے اور ابھی ولی محمد باقی تین روپے جیب میں سے نکال رہا تھا کہ رضیہ کار سٹارٹ کرتے ہوئے بولی۔ "باقی ہماری داری کے۔"

اور داری بولی۔ "مِیرے روپے الگ رکھتے جاؤ ابا۔ میں ان کی قمیص لوں گی۔"

"قمیص لوں گی!" ولی محمد نے سرزنش کے انداز میں کہا۔ "ارے پگلو۔ پہلے جوتا تو لے لو۔ دیکھتی نہیں ہو انگوٹھے باہر نکلے پڑ رہے ہیں۔"

آٹھ دس روز تک ستارہ اور رضیہ چھلیاں لینے روزانہ آتی رہیں۔ اب آتی تھیں تو داری ان سے ہاتھ ملانے لگی تھیں۔ ایک دن وہ پیدل ہی آ نکلیں۔ داری نے انھیں یوں حیران ہو کر دیکھا جیسے اسے یقین نہیں آ رہا کہ وہ پیدل بھی چل سکتی ہیں۔ ستارہ سمجھ گئی۔ بولی۔

"آج ہم کالج نہیں گئیں نا۔ چھٹی تھی۔ ہم یہاں قریب ہی رہتے ہیں۔"

جب وہ چھلیاں لے کر اور داری سے ہاتھ ملا کر چلی گئیں تو کچھ دیر بعد ایک موٹر سائیکل پر سوار دو نوجوان ان کے پاس آ کر رکے۔ ایک بولا۔ "ہمیں بھنتی ہوئی چھلی کی خوشبو نے بلایا ہے۔ دو بھونو پر کوئی دانہ جلے نہیں۔"

"جی اچھا۔" ولی محمد نے دو چھلیاں کوئلوں پر رکھیں۔

پھر ایک نوجوان دوسرے کے کہنی مار کر آہستہ سے بولا۔

"اِدھر دیکھا راجُو۔ لڑکی کو دیکھا؟"

دوسرے نوجوان کے چہرے پر ایسا تاثر چھا گیا جیسے وہ ہکا بکا رہ گیا ہے۔ دونوں داری کو گھورتے ہوئے ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتے اور ہنستے رہے۔ جب ولی محمد نے بھنی ہوئی چھلیاں ان کے حوالے کیں تو ایک نوجوان نے اسے دو روپے دیتے ہوئے پوچھا۔ "اور اس چھلی کا کیا لو گے؟"

"ہر چھلی کا ایک ہی روپیہ ہے صاحب جی۔" ولی محمد نے جواب دیا۔

موٹر سائیکل سٹارٹ کر کے دونوں سوار ہو گئے تو ایک بولا۔

"تم ہمارا مطلب نہیں سمجھے۔ ہم اِس چھلی کی قیمت پوچھ رہے ہیں جو یہ تمھارے پاس بیٹھی ہے۔"

ولی محمد چمٹا ہاتھ میں لیے یوں ایک دم اٹھ کھڑا ہوا جیسے اسے بچھُو نے ڈنک مار دیا ہے۔

اور نوجوان قہقہے مارتے ہوئے ہوا ہو گئے۔

"یہ لڑکے کس چھلی کا پوچھ رہے تھے بابا؟" داری نے پوچھا۔

"میں ان کے منہ پر یہ سارے دہکتے ہوئے انگارے دے مارتا پر وہ نکل گئے۔" ولی محمد غصے سے کانپ رہا تھا۔ "کسی کتے کمینے گھر سے آئے تھے۔ قیمت پوچھ رہے تھے تمھاری۔"

"میری؟" داری حیران رہ گئی اور سسکتی ہوئی اٹھ کر ولی محمد سے لپٹ گئی۔

ولی محمد بولا۔ "میں نے کہا تھا کہ لوگ اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی ہوتے ہیں۔ تمھاری دونوں دوستیں کتنی اچھی ہیں۔ اور یہ لونڈے کتنے برے تھے۔ بس مولا ہی اپنی امان میں رکھے۔" وہ بیٹھ کر کوئلے دہکانے لگا۔

دوسرے روز رضیہ اور ستارہ نے حسب معمول چھلّیاں خریدیں مگر ولی محمد کو نہایت سنجیدہ اور داری کو بالکل چپ دیکھ کر ستارہ نے پوچھا۔ "سچ سچ بتاؤ داری۔ آج کیا تم اپنی پیاری سی مسکراہٹ گھر میں چھوڑ آئی ہو؟"

رضیہ داری کے پاس بیٹھ گئی۔ "اور یہ تمھاری آنکھوں میں پانی سا کیا تیر رہا ہے؟"

داری نے پلو سے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔ "کچھ نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں"

"کبھی کبھی داری اس طرح کھو جاتی ہے بی بی۔ بن ماں کی ہے نا۔" ولی محمد بولا۔

رضیہ اور ستارہ نے داری کے سر اور پیٹھ اور کندھوں کو تھپکا اور ستارہ بولی۔ "نہیں داری۔ اداس نہ ہوا کرو۔ آج ہم نے تمھیں اداس دیکھا ہے تو ہمارا سارا دن برا گزرے گا۔"

اور داری نے مسکرا کر دونوں کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر تھپتھپائے تو رضیہ بولی۔ "داری تم مسکرانے کے سوا اور کوئی کام نہ کیا کرو۔"

دونوں کے جانے کے آدھ پون گھنٹے بعد ان کی قریب ایک

موٹر سائیکل آ کر رکا۔ اس پر وہی دو نوجوان سوار تھے۔ ایک بولا۔ "تم نے کچھ فیصلہ کیا اِس چھلّی کی قیمت کا؟"

ولی محمد اینٹ کا ایک ٹکڑا ہاتھ میں لے کر اٹھا تو دونوں قہقہے لگاتے ہوئے ہوا ہو گئے۔

خوفزدہ داری نے باپ کے ہاتھ سے اینٹ کا ٹکڑا لے کر ایک طرف پھینک دیا۔

ولی محمد بولا۔ "میں ان کا سر پھوڑ دیتا پر یہ سوچ کر میرا ہاتھ رک گیا کہ پکڑا تو میں ہی جاؤں گا۔ پکڑے تو غریب ہی جاتے ہیں نا۔ پولیس کو غریبوں کو پکڑنے اور امیروں کو معاف کر دینے کی عادت پڑی ہوئی ہے۔ اور اگر وہ مجھے پکڑ کر حوالات میں بند کر دیں گے تو میری دارو کا کیا بنے گا۔ بس میں یہ سوچ کر رک گیا۔"

"بابا۔ ہم بیٹھنے کی جگہ نہ بدل لیں؟" داری نے پوچھا۔

ولی محمد بولا۔ "تم کہتی تو ٹھیک ہو پر یہ جو تمھاری دوستیں ہیں' یہ تمھیں کہاں ڈھونڈتی پھریں گے۔ اتنے اچھی لڑکیوں کو یہ بتانا ضروری ہے کہ ہم دو لفنگوں کی وجہ سے اپنا اڈّا بدل رہے ہیں۔"

"ہاں۔ یہ ٹھیک ہے۔" داری نے باپ سے اتفاق کیا۔ "کل بتا دیں گے۔"

اگلے روز جب رضیہ اور ستارہ آئیں تو ولی محمد نے چھلّیاں بھوننے سے پہلے ہی بولنا شروع کر دیا۔ "آج ہم باپ بیٹی آپ کو صرف یہ بتانے کے لیے یہاں بیٹھے ہیں کہ ہم اڈّا بدل رہے ہیں۔ بدلنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔"

"کیوں کیا ہوا؟" رضیہ نے پوچھا

اور ولی محمد نے تفصیل بتائی۔ "دو روز سے دو لفنگے موٹر سائیکل پر سوار آتے ہیں اور مجھ سے میری بیٹی کی قیمت پوچھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ہمیں وہ چھلیاں نہیں، یہ چھلی چاہیے۔ میں یہ سارے دہکتے ہوئے انگارے ان کے منہ پر دے مارتا پر آپ تو جانتی ہوں گی کہ پکڑا بھی میں ہی جاؤں گا۔ یہی علاج سوجھا ہے کہ اڈا بدل لوں۔"

رضیہ نے ولی محمد کو تسلی دی۔ "تم فکر نہ کرو چاچا۔ اب تک برداشت کیا ہے تو کل تک بھی برداشت کرلو۔ کل کے بعد کسی کی مجال نہیں ہوگی کہ ہماری داری کو چھیڑ سکے۔ ہمارے ڈیڈی بہت بڑے افسر ہیں۔ ہم آج ہی انھیں بتائیں گی اور تم دیکھنا کل تک ان لفنگوں کا کیسا بندوبست ہوتا ہے۔ اب بیٹھو ہمیں چھلیاں بھون دو۔"

رضیہ کی باتیں سن کر داری عجیب آسودگی محسوس کرنے لگی تھی۔ ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر تھپتھپاتی رہی اور مسکراتی رہی۔

ان کے جانے کے ٹھیک آدھ پون گھنٹے بعد دونوں لڑکے آئے اور چھلی کی قیمت پوچھتے اور قہقہے لگاتے ہوئے، موٹر سائیکل پوری رفتار سے دوڑاتے ہوئے چلے گئے۔

دوسرے روز رضیہ اور ستارہ نے آکر بتایا کہ انھوں نے اپنے ڈیڈی سے بات کرلی ہے اور انھوں نے ان لفنگوں سے ولی محمد اور داری کا پیچھا چھڑانے کا سارا بندوبست کرلیا ہے۔ ولی محمد نے شکریہ ادا کیا اور داری اپنے ہاتھوں میں ان کے ہاتھ لیے مسکراتی رہی۔

ان کے جانے کے آدھ پون گھنٹہ بعد ہی موٹر سائیکل کی آواز سے دونوں باپ بیٹی چونکے۔ موٹر سائیکل ان کے پاس آکر رکا اور ایک بولا۔ "اس جیتی جاگتی چھلی کے کتنے پیسے؟" قہقہے لگاتے ہوئے وہ روانہ ہوئے ہی تھے کہ بہت سے پولیس والوں کے گھیرے میں آگئے۔ دونوں کو موٹر سائیکل سمیت پولیس کی گاڑی میں ڈال دیا گیا اور آن کی آن میں منظر صاف ہوگیا۔

اور داری ولی محمد سے لپٹ کر رونے اور مسکرانے لگی۔ "دیکھا بابا۔ میری سہیلیوں نے اپنا وعدہ کیسا پورا کیا۔"

ولی محمد نے داری کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "ان کی رگوں میں شریف خون ہے بیٹی۔ اور یہ جو لفنگے پکڑے گئے ہیں نا، یہ کسی نہایت کتے کمینے گھر سے آئے تھے۔"

اگلے روز داری اور ولی محمد دیر تک رضیہ اور ستارہ کے منتظر رہے کہ ان کا شکریہ ادا کرسکیں مگر وہ دن بھر نہ آئیں۔

دوسرے روز بھی دونوں کو انتظار رہا۔

تیسرے دن بھی کوئی نہ آیا۔ دونوں کی تشویش ہوئی۔ داری بولی۔ "کیا ہوگیا میری سہیلیوں کو۔ کہیں وہ بیمار تو نہیں ہوگئیں۔ کہیں ان کی موٹر گاڑی ——"

"خیر کا کلمہ منہ سے نکالتے ہیں بیٹی، خیر کا کلمہ" ولی محمد نے داری کی گفتگو کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔

"پر وہ آتی کیوں نہیں؟ انھیں ہو کیا گیا ہے؟" داری جیسے اپنے آپ سے پوچھتی رہی۔

دس بارہ دن گزر گئے اور رضیہ اور ستارہ غائب رہیں تو ایک روز سڑک پر ٹریفک جام ہو گیا۔ گاڑیاں بہت آہستہ آہستہ رینگ رہی تھیں۔ یکایک داری اچھل پڑی۔ "بابا۔ وہ دیکھو۔"

رضیہ اور ستارہ کی گاڑی فٹ پاتھ کے ساتھ ساتھ سب گاڑیوں کی طرح رینگ رہی تھی۔ داری لپک کر ان کے پاس گئی۔

"آپ کہاں تھیں اتنے دن؟ آپ رکتی کیوں نہیں؟"

دونوں گھبرائی ہوئی تھیں۔ ولی محمد بھی اٹھ کر آ گیا تھا۔ پھر رضیہ نے گاڑی فٹ پاتھ پر چڑھا کر روک لی۔ دونوں گاڑی سے اتریں۔ داری نے ان سے جیسے زبردستی ہاتھ ملایا مگر ان کے ہاتھ تو مردہ ہو رہے تھے۔ "کیا ہوا؟" داری تڑپ تڑپ کر پوچھنے لگی۔ "کیا ہوا تھا آپ کو؟ آپ کے ابا امی ٹھیک ہیں نا؟ آپ خود ٹھیک ہیں نا؟"

رضیہ نے پوچھا۔ "پھر تو ان لفنگوں نے پریشان نہیں کیا نا؟"

"نہیں تو۔" داری بولی۔ "انھیں تو پولیس پکڑ کر لے گئی۔"

ولی محمد بولا۔ "آپ نے ہم پر بڑا احسان کیا بی بی۔ آپ نہ ہوتیں تو ہم اپنی روزی ہی سے جاتے۔"

"پر آپ کو ہوا کیا تھا؟" داری دونوں کے ہاتھ پکڑے کھڑی تھی۔

"ستارہ نہیں بتا پائے گی۔" رضیہ بولی۔ "اس کا گلا بھر آتا ہے۔ مجھ سے سنو۔"

"آپ کا بھی تو گلا بھر آیا ہے۔" داری رضیہ کا ہاتھ پکڑ کر جھنجھوڑنے لگی۔ "خدا کے لیے بتائیے تو۔" اس نے فریاد کی۔

رضیہ بولی۔ "تمھارے پاس آتے ہوئے شرم آتی تھی۔ اب تمھیں بتاتے ہوئے اور شرم آ رہی ہے۔"

"شرم آ رہی ہے؟" داری نے ولی محمد کی طرف بے بسی سے دیکھا کہ شاید وہ رضیہ کی بات سمجھ رہا ہو۔

ولی محمد حیران کھڑا تھا۔ بولا۔ "شرم کی کون سی بات تھی بی بی جی؟"

رضیہ نے بڑی مشکل سے کہا۔ "شرم اس بات کی چاچا کہ جانتے ہو موٹر سائیکل سوار لفنگے جنھیں پولیس پکڑ کر لے گئی، کون تھے؟"

"کون تھے؟" داری نے سوال دہرایا۔

اور ولی محمد بولا۔ "کسی کتے کمینے گھر کے لونڈے تھے، اور کون تھے۔"

"میں بتاتی ہوں وہ کون تھے۔" رضیہ کی آواز بھرا رہی تھی۔

"وہ دونوں ہم دونوں بہنوں کے بھائی تھے!"

✳

ٹریکٹر

علاقے بھر میں ٹریکٹر کے بڑے چرچے تھے۔ چوپالوں پر عجیب عجیب باتیں ہونے لگی تھیں۔

"کوئی مشین اُدھر ولایت سے آئی ہے جسے کھیت میں موٹر کی طرح بھگاتے ہیں تو وہ آن کی آن میں وہاں ہل چلا دیتی ہے۔"

"جس کھیت میں ہم دن بھر ہل چلائیں اور پھر بھی مرلہ آدھ مرلہ رہ جائے' وہاں یہ مشین اتنی دیر میں پورے کھیت کو ادھیڑ ڈالتی ہے جتنی دیر میں جھیورن بھٹی میں مکئی کے مٹھی بھر دانوں کے پھول کھلاتی ہے۔"

"یعنی یوں دو چار چٹکیاں بجانے میں؟"

"ہاں۔"

"اللہ رحم کرے ——!"

چہروں پر تشویش کے سائے چھا جاتے۔ پھر کوئی پوچھتا۔ "اگر ایسی مشین سچ مچ آ گئی ہے تو ہم کسانوں سے کیا کام لیا جائے گا؟"

تاؤ دار سفید مونچھوں والا چاچا مراد' جو المیہ میں طربیہ گھولنے

کا بادشاہ تھا' کہتا "تمہارا تیل نکال کر اس کے انجن میں ڈالا جائے گا۔"

چاچا مراد کو ہنسنے ہنسانے کی عادت تھی۔ ایک بار اس نے رمضان شریف میں اپنے مزارعہ ساتھی رمضان کو کھاتے پیتے دیکھ لیا تو اسے چوپال پر پکڑ لایا اور بولا۔ "بھئی لوگو! اسے دیکھو۔ ماں باپ نے بڑے چاؤ سے رمضان نام رکھا پر یہ عجیب رمضان ہے کہ رمضان شریف میں کھوجا کر رہا تھا۔ اخبار پڑھ لیتا ہے' خط لکھ لیتا ہے تو سمجھتا ہے سارے گناہ بخشوا لیے۔ اخبار تو میں بھی پڑھ لیتا ہوں۔ خط تو میں بھی لکھ لیتا ہوں پر ایک بھی روزہ کھا جاؤں تو مجھے موت کھا جائے۔ اور تُو ایسا بے حیا کہ رمضان نام رکھوا کر اس جوان عمر میں بھی روزہ کھاتا ہے۔ تو رمضان کہاں ہے۔ تو تو کھوجا ہے بدبخت"

تب سے اس نے رمضان کا نام بدل کر کھوجا رکھ دیا تھا۔ جب بھی وہ رمضان کو کھوجے کے نام سے پکارتا' سارا مجمع رمضان سمیت ہنس ہنس کر بے حال ہو جاتا۔ چاچا مراد کا کبھی کسی نے برا مانا ہی نہیں تھا۔

اُس روز تو چاچا مراد نے اپنے مزارعہ ساتھیوں کو ہنسا ہنسا کر سارا خون ان کے چہروں پر اکٹھا کر دیا تھا مگر یہ عجیب ہنسی تھی کہ خوب کُھل کر ہنس لینے کے بعد ہر کسان ایک لمبی آہ بھرتا تھا جیسے یہ سوچ کر رونا چاہتا ہے کہ وہ ہنسا کیوں۔ شاید اسی لیے آج ان کے چہروں کے ساتھ ان کی آنکھیں بھی سرخ ہو رہی تھیں۔

کل چاچا مراد اپنی آنکھوں سے ٹریکٹر دیکھ کر آیا تھا' اس کے زمیندار شاہ جی نے اسے ملک عجب خاں کے ہاں ایک ضروری رقعہ دے

کر بھیجا تھا۔ وہاں اس نے دیکھا کہ ملک عجب خاں کے مربعوں میں ٹریکٹر چل رہا تھا۔ ٹریکٹر کے پیچھے ایک وقت میں گیارہ گیارہ ہل چل رہے تھے اور ابھی ان ہلوں سے کھدی ہوئی مٹی ٹھیک سے بیٹھ بھی نہ پاتی تھی کہ ٹریکٹر کھیت میں گیارہ نئی سیاریں کھودتا ہوا گزر جاتا تھا۔ ٹریکٹر کو چلانے والا، چوروں، ڈاکوؤں کی طرح منڈاسا باندھے بیٹھا تھا۔ وہ دیر تک ٹریکٹر کی کارروائی دیکھتا رہا اور وہ کہانیاں یاد کرتا رہا جن میں دیو آتے ہیں اور بستیوں کی بستیاں ہتھیلی سے دبا کر انھیں چر مر کر دیتے ہیں۔

"اس مشین کا نام ٹریکٹر ہے۔" وہ رمضان کمالے، کرمے اور انیہے کو بتا رہا تھا۔ "نام ہی سے پتہ چل رہا ہے کہ ٹریکٹر جب چلتا ہے تو ٹرٹر بہت کرتا ہے۔"

کسانوں کی ہنسی رکی تو چاچا مراد آگے بڑھا۔ "اس ٹرٹر سے ڈر کر چڑیاں شاخوں پر نہیں اتر پاتیں اور کوے اوپر دائروں میں چیختے چلاتے رہ جاتے ہیں۔ نیچے ایک دیو کا دیو گھوم رہا ہے اور زمین کے بخیے ادھیڑے جا رہا ہے اور اسے چلانے والا صرف ایک آدمی ہے۔ ہم اس وقت کتنے لوگ ہیں یہاں؟ خدا تمھارا بھلا کرے، میرے سمیت پانچ۔ ہم پانچ آدمی دن بھر میں جتنا ہل چلائیں گے، یہ ایک آدمی ٹریکٹر سے اتنی دیر میں چلائے گا جتنی دیر میں کنوئیں میں سے بوکا نکلتا ہے۔"

"تو پھر وہاں ملک عجب خاں کے مزارعے کیا کر رہے ہیں۔" رمضان نے پوچھا۔

اور چاچا مراد بولا "ملک عجب خاں نے انھیں بالغوں کے مدرسے میں بٹھا دیا ہے۔ وہاں وہ الف بے تے پڑھتے ہیں۔ ملک نے

انھیں سمجھایا ہے کہ تم پڑھ کر ڈپٹی بن جاؤ گے۔"

انیہا حیران رہ گیا۔ "ڈپٹی کہ پٹواری؟"

اور چاچا مراد نے اسے سمجھایا۔ "ایک ہی بات ہے برخوردار۔ ڈپٹی ذرا بڑا پٹواری ہوتا ہے —— اور پٹواری ذرا چھوٹا ڈپٹی ہوتا ہے۔"

سب ہنسے مگر ان پر ہنسی کا دورہ تو اس وقت پڑا جب چاچا مراد نے ٹریکٹر کی صورت شکل بیان کی۔ "مجھے دیکھو۔ دوسری بڑی جنگ میں اتنی بڑی بڑی گاڑیاں چلا چکا ہوں کہ دور سے دیکھو تو لگے جیسے ایک کوٹھے کا کوٹھا پہیوں پر بھاگا جا رہا ہے۔ پنشن ملی تو میں ٹرک چلانے لگا۔ پشاور سے کراچی اور کوئٹے تک کے چکر لگائے۔ میں نے دنیا دیکھی ہے۔ تو بس یوں سمجھ لو کہ اگر موٹر کار ایک گھوڑی ہے اور بس ایک گائے ہے اور ٹرک ایک بھینسا ہے تو ٹریکٹر ایک گدھا ہے۔ ٹریکٹر چلانے والا جیسے ایک گدھے پر بیٹھا ہوتا ہے۔ اتنی بد صورت مشین تو میں نے اٹلی میں بھی نہیں دیکھی تھی۔ پھر غضب خدا کا کہ ٹریکٹر کے انجن کی سب تاریں، سب ڈبریاں، سب نلکے نلکیاں ننگی ہوتی ہیں۔ جیسے آدمی کرتا اتار کر پیٹ پر سے چمڑی بھی اتار دے اور اپنی انتڑیوں ہڈیوں کا تماشا دکھاتا پھرے۔"

کسان ہنسی سے فارغ ہو چکے تو چاچا مراد بولا۔ "اس کے پہیے بھی دیکھنے کی چیز ہوتے ہیں۔ آگے دو چھوٹے پہیے جیسے بسوں ٹرکوں کے ہوتے ہیں مگر پیچھے دو اتنے بڑے —— اتنے زیادہ بڑے پہیے کہ لگتا ہے، پہیوں کی جگہ رہٹ فٹ کرا لیے ہیں۔ لیٹے ہوئے رہٹ کو کھڑا کر دو

تو سمجھو ٹریکٹر کا پچھلا پہیہ کھڑا ہے۔ میں نے ٹریکٹر کے پچھلے پہیے دیکھے تو کھوجے کا بیٹا جانو یاد آ گیا۔ ہاتھ بھر کا تو ہے پر ایک دن اپنے باپ کا ہاتھ بھر کا جوتا پہنے پھرتا تھا۔"

کسان ہنسے جا رہے تھے اور ابھی ان کے آہ بھرنے کا مرحلہ نہیں آیا کہ چاچا مراد بولا۔ "جتنا ہنسنا ہے، ہنس لو۔ ہنسی نہ آئے تو ہنسنے کی کوشش کرو۔ کیونکہ اگر شاہ جی نے بھی اپنی زمینوں کے لیے ملک عجب خاں کی طرح ٹریکٹر خرید لیا، تو پھر ہاتھ پر ہاتھ دھر کر رونے بیٹھ جاؤ گے اور عمر بھر روتے رہو گے۔ تمھارے بیل بِک جائیں گے اور تمھارے ہلوں کی ہتھیاں ٹوٹ جائیں گی۔ میں ایک دن مودے موچی کے پاس بیٹھا تھا۔ اوپر سے ایک ہوائی جہاز گزرا تو ہم سب اسے دیکھنے لگے۔ تب مُودے نے ایک عجیب بات کہہ دی۔ وہ بولا۔ "جب ہوائی جہاز کا کوئی کل پرزہ خراب ہو جاتا ہے نا، تو اوپر آسمان پر اس کا کام ختم ہو جاتا ہے۔" تم بھی یہی سمجھو کہ اگر ٹریکٹر اِدھر شاہوں کی زمینوں میں بھی آ گھسا تو کھیتوں میں تمھارا کام ختم ہو گیا۔ پھر اُدھر شہروں کی طرف جا کر چاہے اینٹ گارا ڈھونا، چاہے بھیک مانگنا، ٹریکٹر کو تو چلنا ہے، سو وہ چلتا رہے گا۔ اور وہ تیل سے چلتا ہے، تمھارے خون پسینے سے نہیں چلتا۔"

سب سانس روکے کھڑے تھے جیسے قیامت کے آخری دھماکے کا انتظار کر رہے ہیں۔

اور قیامت کے اس دھماکے میں دیر نہ لگی۔

اچانک ان کے پاس شاہ جی کی کار آ کر رکی جسے ان کا نوجوان بیٹا لاڈو شاہ چلا رہا تھا۔ کار سے نکل کر شاہ جی نے چاچا مراد کے کندھے پر

ہاتھ رکھ کر سب سے پوچھا۔ "کن سوچوں میں پڑے ہو تم لوگ؟" پھر مراد سے کہا۔ "چاچا ذرا اُدھر تو دیکھنا جدھر سے لاڈو شاہ گاڑی لایا ہے۔"

چاچا مراد سمیت سب نے اُدھر دیکھا۔ قیامت آ گئی تھی۔ کچے راستے پر شاہ جی کا نیا نویلا ٹریکٹر دھول کے طوفان اڑاتا، کسانوں کی طرف یوں بڑھا آ رہا تھا جیسے پرانے زمانے کی جنگوں میں ہاتھی دشمنوں پر یلغار کرتے تھے۔

شاہ جی جب سے کار سے اترے تھے، مسکرائے جا رہے تھے۔

"دیکھا چاچا، آ گیا تم لوگوں کا ہتھیار۔"

ہم لوگوں کا کہ آپ کا؟ ——— سب کے دلوں میں بیک وقت ایک ہی سوال ابھرا، اور پھر ان بے شمار سوالوں کی طرح ڈھیر ہو گیا جو ان کے اندر ابھرتے اور مرتے رہتے تھے۔

ٹریکٹر ان کے پاس آ کر رک گیا۔ اسے ملک عجب خاں کا وہ مزارعہ چلا رہا تھا جو چاچا مراد کے ہمراہ اٹلی اور لیبیا کے محاذوں پر لڑ چکا تھا اور جو فوجی ٹرک چلانے کا ایسا ماہر تھا کہ سب اسے استاد کہتے تھے۔ اس نے ٹریکٹر سے اتر کر چاچا مراد کو سینے سے لگایا اور شاہ جی کو بتانے لگا۔ "ہم تو پرانے یار ہیں شاہ جی کل جب یہ ہمارے ملک کے مربعوں پر سے گزرا تو میں نے اسے پہچان لیا تھا پر یہ مجھے نہ پہچان سکا۔ میں منڈاسا باندھ کر ٹریکٹر چلاتا ہوں۔ ورنہ ہر شام کھانس کھانس کر ٹوکرا بھر مٹی تھوکنا پڑے۔ میں نے سوچا کل شاہ جی کا ٹریکٹر لے کر ادھر آنا ہی ہے تو اپنے یار سے کل مل لیں گے۔ لوگ استاد تو مجھے کہتے ہیں پر اصلی ٹرک ڈرائیور یہ مراد ہے۔ اٹلی کے ایسے ایسے راستوں پر سے بھاری

ٹرک گزار لاتا تھا کہ وہاں سے جیپ بھی گزرے تو الٹ جائے۔ ٹریکٹر تو اس کے آدھے گھنٹے کی مار ہے۔"

"میں؟" چاچا مراد کی تو جیسے چیخ نکل گئی۔ پھر اس نے اپنے چاروں ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ پھر شاہ جی کی طرف مڑا۔ "میں شاہ جی؟ میں ٹریکٹر چلاؤں گا؟ میرے تو باپ نے بھی ٹریکٹر نہیں چلایا۔"

" تمھاری باپ نے ٹرک بھی نہیں چلایا تھا۔" اور پھر شاہ جی، لاڈو شاہ اور استاد زور زور سے ہنسے۔

چاچا مراد نے ایک بار پھر پلٹ کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا مگر نظروں کا ٹھیک سے تبادلہ بھی نہیں ہو پایا تھا کہ شاہ جی نے اسے دونوں کندھوں سے پکڑ کر اپنی طرف موڑ لیا۔ "کل آدھ گھنٹے تک تم ٹریکٹر پر استاد کے ساتھ بیٹھ جاؤ اور بس۔ ٹریکٹر تمھاری مٹھی میں آ جائے گا۔"

"پر شاہ جی، میں؟ ——" چاچا مراد اپنی تاؤ دار مونچھوں کے باوجود ہکلانے لگا۔ "میں کیسے شاہ جی؟—— میں تو —— میں تو بیلوں سے ہل چلاتا ہوں۔"

"ٹریکٹر کو مشینی بیل سمجھ لو۔" استاد پھر بولا اور ایک بار پھر شاہ جی، لاڈو شاہ اور استاد نے زور زور کے قہقہے لگائے۔ استاد بولا۔ "ملک عجب خاں جب پہلے پہلے ٹریکٹر لائے تو میں بھی یوں ہی بدکا تھا جیسے اب مراد بدک رہا ہے۔ نئی چیز سے ہر کوئی بدکتا ہے۔ ابا کہتا تھا، وہ اپنے گاؤں میں پہلی بار چور بتی —— یہی —— ٹارچ لایا، اور جب شام کو اسے جلایا تو اس کی چکا چوند دیکھ کر اماں چیخ مار کر بے ہوش ہوتے

ہوتے رہ گئی تھی۔"

"یہ زیادتی ہے استاد۔" لاڈو شاہ پہلی بار بولا۔ "چاچا مراد نے نہ چیخ ماری ہے، نہ اس کا بے ہوش ہونے کا ارادہ ہے۔ وہ تو بس ذرا سا حیران ہوا ہے اور آدمی پہلی بار تو حیران ہوتا ہی ہے۔"

"وہ تو سب ٹھیک ہے شاہو بادشاہو۔" چاچا مراد نے جیسے اپنے آپ کو سمیٹنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "پر ٹریکٹر تو ایک ہی آدمی چلاتا ہے نا، میں چلاؤں گا تو باقی چار کہاں ——" یہ کہتے ہوئے وہ اپنے کسان ساتھیوں کی طرف پلٹا مگر وہ تو وہاں سے جا چکے تھے۔ "کہاں چلے گئے یہ چاروں؟" اس نے جیسے اپنے سمیت سب سے پوچھا۔

"ان کی فکر نہ کرو چاچا۔" شاہ جی نے کہا۔

"کیسے فکر نہ کروں شاہ جی" چاچا مراد نے بڑے دکھ سے کہا۔ "وہ تو میرے بچے ہیں۔"

اور شاہ جی بولے۔ "ان کا بندوبست کر لیا ہے۔ اُدھر سرگودھا اور فیصل آباد کی ملوں میں میرے کئی دوست ہیں وہ انھیں کھپا لیں گے۔ تم مزے سے اپنا ٹریکٹر چلاؤ۔ تمھارے بچے بھی مزے میں رہیں گے۔"

"یہ بھی تو بتا دو شاہ جی" استاد بولا۔ "کہ مراد دوسروں کے کھیتوں میں ٹریکٹر چلائے گا تو اسے ایک روپے کے پیچھے چونی ملے گی۔ دن بھر میں سو روپیہ کمایا تو پچھتر شاہ جی کے اور پچیس تمھارے۔ سوچو مراد۔ ہر روز پچیس روپے تو مہینے میں کتنے؟ —— کتنے ہوئے لاڈو شاہ؟ —— سات آٹھ سو تو ہوتے ہیں۔ ایک ہزار سمجھ لو۔ اور ایک ہزار افسر مال کی تنخواہ ہوتی ہے۔ چلو مراد اب ٹریکٹر پر ہاتھ پھیرو۔ ادھر

آؤ۔"

استاد نے چاچا مراد کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچا' سو اس نے پہلا قدم تو ایک جھٹکے سے اٹھایا' مگر پھر ہموار رفتار سے ٹریکٹر کے پاس پہنچا اور اس کے انجن پر ہاتھ رکھ دیا۔

"مبارکاں' مبارکاں۔" استاد پکارا۔ "چلو اب ٹریکٹر پر بیٹھ کر ذرا وہاں تک جاتے ہیں ——— چلو آؤ ——— تم بھی آ جاؤ لاڈو شاہ۔"

——— اور صبح کو شاہ جی کے چاروں مزارعے اور ان کے بچے شور سن کر اپنے گھروندوں سے نکلے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ٹریکٹر ایک کھیت کو ادھیڑے جا رہا ہے۔

"کہیں اسے چاچا تو نہیں چلا رہا ہے؟"

"ہاں چاچا ہی تو ہے؟"

اندر سے ان کی مائیں' بیویاں' بہنیں اور بیٹیاں بھی نکل آئیں۔ "ہائے میں مرجاؤں یہ تو اپنا چاچا مراد ہے۔"

پھر یہ ہجوم کھیت کنارے جمع ہو گیا اور جب چاچا مراد ٹریکٹر چلاتا ہوا ان کے پاس سے گزرا تو انھوں نے دیکھا کہ اس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا رکھا تھا اور اس کا سادا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ رہا تھا اور اس کی سفید مونچھوں میں آنسوؤں کے قطرے اٹک گئے تھے۔ پھر اس نے ٹریکٹر روکا۔ اور جب سب اس کے پاس آئے تو وہ اپنے پیٹ کو تھپتھپاتے ہوئے' بھرائی آواز میں بولا۔ "ساری بے وفائی اس کی ہے میرے بیٹو بیٹیو' سارا کفر یہاں سے پھوٹتا ہے۔ ساری دوستیاں یہاں دم

توڑ دیتی ہیں۔ مجھ معاف کر دو۔ اللہ تمھارا راکھا" ——— پھر اس نے آستینوں سے آنسو پونچھے اور ٹریکٹر چلا کر آگے بڑھ گیا۔

شاہ جی نے چاروں کو سرگودھا اور فیصل آباد کے دوستوں کے نام چٹھیاں دیں اور انھیں چلتا کیا۔ وہ جب بیل گاڑیوں پر اپنے کھاٹ کھٹولے اور بچے لادے کھیتوں میں سے گزرے تو چاچا مراد اس وقت بھی ٹریکٹر چلا رہا تھا۔ انھیں جاتا دیکھ کر اس نے ٹریکٹر روکا اور ٹریکٹر پر سے اتر کر ان کی طرف بڑھا مگر پھر لڑکھڑا گیا اور پگڑی کا پلو ہاتھ میں لے کر مروڑا اور اسے آنکھوں پر رکھ کر رونے بیٹھ گیا۔ رمضان کملا لا کر ما اور الٰہیا ذرا کی ذرا رکے مگر پھر اپنے بیوی بچوں سمیت آگے بڑھ گئے۔ انھوں نے بھی اپنی پگڑیوں کے پلو آنکھوں پر لے رکھے تھے۔ چاچا مراد دیر تک کھیت میں بیٹھا ان کی رینگتی ہوئی بیل گاڑیوں کے پہیوں سے نکلتی ہوئی سسکیاں سنتا رہا۔

مہینے کے بعد جب چاچا مراد اپنے شاہ جی کے پاس حساب کتاب کرنے آیا تو شاہ جی کو ایک دم ہنسی چھوٹ گئی۔ "حد ہو گئی چاچا" انھوں نے ہنسی کے آخری جھٹکوں کے درمیان کہا۔ "تم نے اتنی دنیا دیکھی ہے پر بھولے کے بھولے ہی رہے۔ تم تو کچھ پڑھ لکھ لیتے ہو۔ کبھی کسی اخبار میں اس طرح کی بات پڑھی ہے کہ مالک نے روپے میں سے چونی اپنے مزدور کو دے دی؟ یہ تو تمھیں منانے کا ایک طریقہ تھا۔ وہ چاروں جوان لوگ تھا۔ اپنی جگہ بنا لیں گے۔ پر تم بوڑھے آدمی ہو۔ میں نے سوچا یہاں سے نکلو گے تو کہاں کہاں کی خاک چھانتے پھرو گے۔ میں نے

استاد کو پہلے سے سمجھا دیا تھا' سو اس روز وہ اُدھر تم سے روپے میں چونی کی بات کر رہا تھا تو اِدھر مجھے آنکھ بھی مارے جا رہا تھا۔ پرانا گھاگ ہے۔ جانتا ہے ہماری تمھاری کمزوریاں۔ سو چاچا' لاکھ سوا لاکھ کے تو ٹریکٹر اور ٹرالی اور تھریشر ہیں۔ پہلے ان کی قیمت تو پوری ہو لینے دو۔ پھر اپنا لاڈو شاہ بھی ٹریکٹر چلانا سیکھ گیا ہے۔ سارا فالتو کام وہ سنبھال لے گا۔ تم ہمارے کھیتوں میں ٹریکٹر چلاؤ' وہ دوسروں کے ہاں چلائے گا اور تمہیں حساب کتاب کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ ویسے تو ہل نہ چلایا ٹریکٹر چلا لیا۔ تمھارے لیے ایک ہی بات ہے' پر چلو تمہیں ٹریکٹر چلانے کے تیس چالیس ہر مہینے دے دوں گا ورنہ ہالیوں کو کب کسی نے تنخواہیں دی ہیں۔ سارا کام بٹائی پر چلتا ہے۔ پر تم پرانے آدمی ہو۔ ٹھیک ہے نا؟ —— بولو' ٹھیک ہے؟"

"ٹھیک ہے شاہ جی۔" چاچا مراد نے آنسو پی کر کہا۔ "بالکل ٹھیک ہے۔ آپ مالک ہیں۔ آپ کو ٹھیک ایسا ہی کرنا چاہیے۔ آپ ایسا نہیں کریں گے تو آپ میں مجھ میں فرق کیا رہے گا۔ رہا میں' تو میرے چاروں بچوں کو مجھ سے جدا کر کے آپ نے میرے بازو بھی کاٹ لیے اور ٹانگیں بھی توڑ دیں۔ اب تو میں ایک لوتھ کی لوتھ ہوں۔ پھر آپ کا نمک بھی کھایا ہے اور آپ کی زمینوں کی مٹی بھی پھانکی ہے۔ آپ کے در پر پڑا ہوں۔ ہشکارتے رہیے اور اپنا کام لیتے رہیے۔" اور وہ وہاں سے اٹھ آیا۔

بعد میں شاہ جی نے لاڈو شاہ کو اس کے پاس بھیجا۔ ٹریکٹر چلانے کی اجرت پچاس تک بڑھا دی گئی اور دوسروں کے کھیتوں میں ٹریکٹر سے

ہونے والی کمائی میں روپے کے پیچھے پانچ پیسے' لیکن اس شرط کے ساتھ کہ دوسروں کے کھیتوں میں ٹریکٹر جتنا ڈیزل کھائے گا' اس کے لیے مراد کو بھی روپے کے پیچھے پانچ پیسے ادا کرنی ہو گئی۔ حساب کتاب کون کرتا۔ چاچا مراد فوراً مان گیا۔ "مانے بغیر کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے لاڈو شاہ۔ اب اس عمر میں ٹرک میں چلا نہیں سکتا اور ٹریکٹروں کے آ جانے سے بیلوں کی جوڑیاں اسی طرح بے معنی ہو گئی ہیں جیسے موٹر کار آ جانے سے تمھاری گھوڑیاں بے معنی ہو گئی تھیں۔"

کوئی سال بھر گزرا تھا کہ ٹریکٹر چلتے چلتے رکنے لگا۔ چاچا مراد نے اس کے انجن کے سب انچ پیچ سمجھ لئے تھے۔ اس لیے جونہی کوئی خرابی پیدا ہوتی' وہ اسے ٹھیک کر لیتا اور ٹریکٹر چلنے لگتا' مگر جب ٹریکٹر کا ڈیزل بار بار رکنے لگا اور وہ دن بھر میں آدھے سے بھی کم کام کرنے لگا تو شاہ جی نے چاچا مراد کو اجازت دے دی کہ وہ لاڈو شاہ کے ساتھ ٹریکٹر کو شہر لے جائے اور وہاں اپنے سامنے اس کی مرمت کرا لائے۔

صبح کو چاچا مراد اور لاڈو شاہ ٹریکٹر پر شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ دوپہر کو شہر میں داخل ہونے ہی والے تھے کہ انھیں سڑک کے کنارے ٹریکٹروں کی ایک ورکشاپ نظر آئی —— کسان ٹریکٹر ورکشاپ —— ٹریکٹر کے بڑے پہیے کے ایک پرانے ٹائر کو ورکشاپ والوں نے یوں بلندی پر لٹکا رکھا تھا جیسے اسے سولی دے رکھی ہو۔ باہر دو ٹریکٹر بھی کھڑے تھے۔ ان کے انجن کھلے پڑے تھے اور چند لوگ اور دو چار بچے زمین پر بیٹھے' ان کی صفائی اور مرمت میں مصروف تھے۔

چاچا مراد نے ٹریکٹر کو ورکشاپ کے سامنے روکا تو سب نے

پلٹ کر اس کی طرف دیکھا اور پھر ان میں سے تین آدمی ایک ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے ہاتھ سیاہ ہو رہے تھے اور گرمی کی وجہ سے پسینہ پونچھتے ہوئے انھوں نے اپنے چہرے کو بھی جگہ جگہ سے سیاہ کر ڈالا تھا۔

تینوں ایک ساتھ چاچا مراد کی طرف بڑھے اور پکارے "چاچا!"

چاچا مراد حیران کھڑا انھیں گھورتا رہ گیا۔

"ہمیں نہیں پہچانا چاچا؟" ایک نے پوچھا۔

"چاچا ذرا غور سے دیکھو۔" دوسرا بولا۔

"کیوں چاچا۔ بس اتنی یاری تھی کہ اپنے بچوں کو بھی نہیں پہچانتے!" تیسرے نے طنز کیا۔

چاچا انھیں مسلسل گھور رہا تھا اور لاڈو شاہ حیران کھڑا سوچ رہا تھا کہ یہ کیا تماشا ہے۔

ایک دم چاچا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے ان میں سے ایک کے کندھے پر دونوں ہاتھ رکھ دیے۔ "ارے تم کہیں الٰہیا تو نہیں ہو؟"

"الٰہیا ہی تو ہوں" اس نے کہا اور چاچا مراد سے لپٹ گیا۔ پھر الگ ہو کر بولا۔ "یہ کرما ہے اور یہ کمالا ہے۔"

چاچا مراد نے ان دونوں کو بھی سینے سے لگایا۔ پھر پگڑی کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے مسکراتے ہوا بولا۔ "رمضان کدھر ہے جو رمضان شریف میں کھوجا کرتا ہے؟"

تینوں ہنسے، پھر الٰہیا بولا۔ "وہ اس ورکشاپ کا مینجر ہے چاچا۔ اب نہ وہ رمضان ہے نہ کھوجا ہے۔ اب وہ ملک رمضان احمد خاں ہے۔

اندر میز کرسی لگا کر بجلی کے پنکھے تلے بیٹھا ہے۔ آؤ۔"

الٰہیا چاچا مراد کا ہاتھ پکڑ کر جانے لگا۔ کرما اور کمالا ان کے آگے آگے بچوں کی طرح بھاگتے ہوئے ان سے پہلے ہی ورکشاپ کے دفتر میں گھس گئے۔

"ابھی آتا ہوں لاڈو شاہ۔" چاچا مراد نے پلٹ کر کہا۔ "اپنے بچوں سے مل لوں۔" پھر وہ الٰہیا سے کہنے لگا۔ "پر یہ سارا علم تم نے کہاں سے سمیٹا؟ رمضان تو خیر میری طرح کچھ اکھڑ ڈالنا جانتا تھا۔ پر تم تینوں تو لٹھ کے لٹھ تھے۔ تم کیسے انجنوں مشینوں میں گھس گئے؟"

رمضان کو کرما اور کمالا خوش خبری سنا چکے تھے سو اس کا چہرہ پہلے ہی لال ہو رہا تھا۔ اس نے چاچا مراد کو دیکھا تو اتنی تیزی سے اٹھا کہ کرسی ہی الٹ گئی۔ چاچا کو چھاتی سے بھینچنے کے بعد وہ بولا۔ "چاچا کے لیے روح افزا کا ایک جگ بنوالا کرم الٰہی"۔

"کرم الٰہی!" چاچا نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

"وہی تمھارا بیٹا کرما" رمضان نے اسے بتایا۔ "اور یہ کمالا۔ یہ اب کمال دین ہے، اور الٰہیا یہ اب الٰہی بخش ہے۔ اور یہ کسان ٹریکٹر ورکشاپ تمھارے ان چاروں بچوں کی ہے۔ ہم چاروں تم سے جدا ہوئے تو سوچا کہ زمانہ تو بدل گیا ہے اور اگر ہم نہ بدلے تو زمانہ ہمیں کوڑا سمجھ کر اور گھورے پر پھینک کر آگے بڑھ جائے گا۔ ہم نے سوچا ہمیں بھی بدلنا چاہیے۔ ٹریکٹروں کا زمانہ ہے تو ٹریکٹر کا انجر پنجر ہی سمجھ لیں۔ سو ہم نے شاہ جی کے رقعے نہر میں بہا دیے اور فیصل آباد چلے گئے اور وہاں کی ورکشاپوں میں مزدور بن گئے۔ آہستہ آہستہ، چوری چوری،

ہم نے ٹریکٹر کی ایک ایک رگ گن لی اور ابھی دو مہینے پہلے ہم نے یہ ورکشاپ کھول لی۔ ان دو مہینے میں سے ہر مہینے ڈھائی ہزار کی آمدنی ہوئی ہے۔ پانچ پانچ سو ہم میں سے ہر ایک کے حصے میں آئے اور باقی پانچ سو اس جگہ کا کرایہ اور باہر کام کرنے والے چھوکروں کی مزدوری۔ اللہ کا کرم اور رسولؐ کی رحمت ——— اور چاچا مراد کی دعا۔"

"میری دعا؟" چاچا مراد چونکا۔ "طعنہ مار رہے ہو؟"

"ہماری مجال ہے چاچا۔" رمضان نے چاچا کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ "بچے اپنے باپ کو کیا طعنہ ماریں گے۔ بات یہ ہے چاچا کہ تم وہاں رہنے پر مجبور تھے اور ہم وہاں سے چلے آنے پر مجبور تھے۔ پر جب ہم شاہ جی کے کھیتوں سے نکلے تھے تو ہماری طرح تم بھی رو رہے تھے۔ پتہ نہیں وہ افسوس کے آنسو تھے یا پچھتاوے کے پر وہی آنسو ہمارے لیے تمھاری دعا بن گئے۔ تم شاہ جی کا منت ترلا کر کے ہمیں روک بھی لیتے تو ہم آج بھی بیٹھے بیٹھے کاٹ کتر رہے ہوتے۔ تم ٹھیک ٹھاک تو ہو نا چاچا؟"

کرما روح افزا سے جگ بھر لایا تھا۔ وہ گلاس بھرنے لگا تو چاچا نے اسے روک دیا۔ "ذرا ٹھہرو۔" وہ بولا۔ "پہلے مجھے بات کر لینے دو کہ میرے آنسوؤں سے تمھارا شربت نمکین نہ ہو جائے۔ سنو۔ تم چلے گئے اور میرے بازو کٹ گئے اور ٹانگیں ٹوٹ گئیں۔ میں شاہ جی کی ڈیوڑھی کے باہر دم ہلاتا رہ گیا۔ صبح سے شام تک ٹریکٹر چلا چلا کر میری بوڑھی ہڈیاں بجنے لگیں۔ میری مونچھ کا تاؤ تو مونچھوں کی عادت بن گئی ہے ورنہ اندر سے میرے سارے تاؤ ٹوٹ چکے ہیں۔ میں شاہ جی کے دکھنی

کھیت کے اس ٹھنٹھ کی طرح اکیلا ہوں جس پر دن میں کوے اور رات میں الو بولتے ہیں۔ شکر ہے تم مجھے جیتے جی مل گئے کہ میری کچھ ہمت بندھی ہے۔ اس سہارے تھوڑا سا اور جی لوں گا۔ اللہ تمھیں برکت دے، تم نے تو کمال کر دکھایا۔ میں تو وہیں پڑا ہوں جہاں پڑا ہوں۔ نہ اب ٹرک چلا سکتا ہوں، نہ مزدوری کر سکتا ہوں۔ میں اور کہا جا سکتا ہوں۔"

"تم ہمارے پاس آ سکتے ہو۔" رمضان بولا۔ "برابر کے حصے دار۔ کیوں بھئی؟" اس نے ساتھیوں سے پوچھا۔

"ہم چاچا کو اب جانے ہی نہیں دیں گے۔" الہیا نے فیصلہ سنایا۔

"ہم ٹریکٹر کے سامنے لیٹ جائیں گے۔" کمالا بولا۔

"تم کہو تو میں لاڈو شاہ کو چلتا کروں۔" کرما باہر جانے کو مڑا۔

"نہیں۔" چاچا مراد کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور اس کے ہونٹ اور ہاتھ کانپ رہے تھے۔ "تم ننھے منے غریب لوگ، تمھارے پاس اتنے ہاتھ ہاتھ بھر کے کلیجے کہاں سے آ گئے میرے بچو، میرے پُترو!" چاچا چاروں کو بازوؤں میں سمیٹے کھڑا رو رہا تھا۔ پھر ان سے الگ ہو کر آنکھیں پونچھیں، مونچھوں کو تاؤ دیا اور بولا۔ "لاڈو شاہ کے ٹریکٹر کا ڈیزل رکتا ہے۔ پہلے اسے تو ٹھیک کرو۔ اور اسے ایک گلاس شربت بھی پلا دو۔"

رمضان نے لاڈو شاہ کو شربت پلایا اور باقی تینوں ٹریکٹر کی طرف متوجہ ہو گئے۔ انھوں نے ٹریکٹر کے ڈیزل کو پندرہ بیس منٹ میں

یوں چالو کر دیا جیسے وہ کبھی رکا ہی نہیں تھا۔ ٹریکٹر کی آواز ہی بدل گئی تھی۔

لاڈو شاہ نے مزدوری ادا کرنے کے لیے بٹوا نکالا تو چاچا مراد بولا۔ "نہیں لاڈو شاہ ! یہ غضب نہ کرنا۔ یہ میرے بچے برا مان جائیں گے۔"

چکرائے ہوئے لاڈو شاہ نے بٹوا جیب میں ڈالا اور بولا۔ "اچھا تو چلو چاچا' اب چلیں۔"

"تم چلو لاڈو شاہ" چاچا مراد بولا۔ "اپنے بابا جی سے کہنا' میں نے اس مہینے کی تنخواہ اور اس فصل کی بٹائی تمہیں بخشی۔ کوئی غلطی ہو گئی ہو تو معاف کر دینا۔"

پھر چاچا مراد اپنے چاروں پرانے ساتھیوں میں سے دو کو ایک بازو میں اور دو کو دوسرے بازو میں لیتے ہوئے جب بولا تو اس کی آواز بہت گمبھیر ہو رہی تھی۔ "اب میں نہیں آ سکوں گا۔ اس عمر میں بھلا اپنا گھر اور اپنے بچے چھوڑ کر کون پردیس جاتا ہے۔ تم جاؤ۔ اللہ راکھا۔"

✱